فتاویٰ قاضی

فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

ایفا پبلیکیشنز

فتاویٰ قاضی

فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ
(قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
و بانی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

ایفا پبلیکیشنز
۱۶۱-ایف جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

کتاب ---------------------- : فتاویٰ قاضی

افادات ---------------------- : فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

ترتیب و تحشیہ ---------------------- : امتیاز احمد قاسمی

سن اشاعت ---------------------- : ۱۴۲۵ھ - ۲۰۰۴ء

صفحات ---------------------- : ۲۴۵

قیمت ---------------------- : 125 روپے

تعداد ---------------------- : گیارہ سو

ناشر ---------------------- : **ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی**

مطبع بھارت آفسٹ، دہلی-۶

ملنے کا پتہ

قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

بی-۳۵، بیسمنٹ، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳

فہرست مضامین

''اللہ تعالی نے جن کو تفقہ عطا کیا انہوں نے ہر عہد میں امت کی رہنمائی کی اور بدلتے ہوئے حالات میں انفرادی اور اجتماعی امور میں واضح ہدایات پیش کیں۔ پندرہ سو سال کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ فقہاء نے ہر دور میں اپنا خون جگر جلا کر اور قرآن وسنت کے بحر معانی میں ڈوب کر مسائل کا حل پیش کیا اور اصول وقواعد فقہیہ مرتب کیے، نیز احکام کے استنباط میں پوری زندگی قربان کردی، اللہ کے ان بندوں کا پیش کردہ عظیم فقہی وعلمی سرمایہ امت کا بہت بیش قیمت اور قابل فخر سرمایہ ہے۔''

قاضی مجاهد الاسلام قاسمیؒ

عنوانات — صفحات

عنوانات — صفحات

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

(حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اسلام رب العالمین کا بھیجا دین ہے جو اپنی مکمل صورت میں سید الکونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس روئے زمین پر انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو تاریکی دنیا میں پھیل گئی تھی، اسلام کے آفتاب نے اس کو دور کیا اور اپنی نورانی کرنوں سے پورے عالم کو منور کیا، اس نے بھولے بھٹکے انسانوں کو راہ راست دکھائی اور اس رشتہ کو یاد دلایا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ہونا چاہئے۔

یہ ظاہر ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے، آپ پر نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور اعلان کر دیا گیا کہ آپ کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آسکتا، لہٰذا انبیاء پر اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری ہوتی ہے وہ قدرتی طور پر آنحضرت ﷺ کی امت پر آپڑی، اسی کی تعبیر امام احمد بن حنبلؒ نے فرمائی ہے: "قام أبو بکر یوم الردة مقام الأنبیاء" (حضرت ابوبکر فتنۂ ارتداد کے وقت انبیاء کی جانشینی فرما رہے تھے)۔

چنانچہ امت محمدیہ اور اس کے اکابر نے اس فرض کو محسوس کیا، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غفلت نہیں برتی اور انشاء اللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد علماء امت سے جو فریضہ متعلق ہوا ان میں ایک احکام شرعیہ کی رہنمائی بھی ہے، جس کو اصطلاح میں "فتویٰ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، فقہ وفتاوی کی ضرورت واہمیت کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، اس فریضہ کو سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا، خود قرآن مجید میں آپ کے اس منصب کی طرف اشارہ موجود ہے، آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ اور صحابہ کے بعد فقہاء تابعین نے اس بار امانت کو سنبھالا، لیکن اس فن کی باضابطہ تدوین وترتیب کے لئے اللہ رب العزت نے اپنے جس بندہ کا انتخاب فرمایا وہ امام ابوحنیفہ ہیں، جو تابعی تھے، آپ کی ولادت سن ۸۰ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۵۰ ہجری میں، اس طرح پہلی صدی ہجری میں اس اہم فن کی باضابطہ اور فنی تدوین کا کام شروع ہوگیا۔

پھر امام ابوحنیفہ کی خداترسی اور احتیاط یہ ہے کہ آپ اپنے علم وفضل کے اعتبار سے اس خدمت کو تنہا بھی انجام دے سکتے تھے، لیکن آپ نے تنہا کام کرنے کے بجائے اپنے دور کے مختلف فنون کے ماہرین کو ساتھ لیا، اور ان کے تعاون سے یہ خدمت انجام دی، تاکہ غلطی کا امکان کم سے کم ہو، پھر کام کا نہج بھی خود متعین فرمادیا کہ احکام شرعیہ کا اولین مآخذ قرآن مجید ہوگا، جو احکام قرآن مجید میں نہیں ہیں، تو سنت رسول سے رجوع کیا جائے گا، اگر حدیث میں بھی موجود نہ ہو تو اقوال صحابہ سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

چنانچہ ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) نے امام ابوحنیفہ کی نسبت سے لکھا ہے:
"الحاصل أن التابعين أفضل الأمة بعد الصحابة فنعتقد أن الإمام الأعظم والهمام الأقدم أبو حنيفة أفضل الأئمة المجتهدين وأكمل الفقهاء فی علوم الدين" (شرح فقہ اکبر ص ۱۴۶) (حاصل یہ ہے کہ صحابہ کے بعد امت میں سب سے افضل گروہ تابعین کا ہے، پس ہمارا عقیدہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ ائمہ مجتہدین میں سب سے افضل اور فقہاء علوم دین میں سب سے کامل امام ہیں)۔

علماء راسخین نے صراحت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار،

پرہیزگار، کریم النفس اور دین کے باب میں محتاط تھے، احتیاط کا حال یہ تھا کہ ذاتی رائے کے اظہار سے اجتناب برتنے کی کوشش کرتے، کسی بھی علمی مسئلہ میں عام طور پر اس وقت تک جواب نہیں دیتے جب تک اہل علم کو جمع کر کے کھلے طور پر بحث نہیں کرلیتے، اور ان کی تائید حاصل نہیں ہوجاتی (دیکھئے: ردالمحتار ۱/ ۲۲)۔

اسی تقاضہ احتیاط کے تحت آپ نے فرمایا کہ جو صحیح حدیث سے ثابت ہو، وہی میرا مذہب ہے: "إذا صح الحديث فهو مذهبی" (عقود رسم المفتی)۔

نیز آپ کے بارے میں منقول ہے: "سئل أبو حنيفه إذا قلت قولا وكتاب الله يخالفه قال اتركوا قولی بكتاب الله فقيل إذا كان خبر الرسول ﷺ يخالفه قال اتركوا قولی بخبر رسول الله ﷺ فقيل إذا كان قول الصحابة يخالفه قال اتركوا قولی بقول الصحابة" (عقد الجید للشاہ ولی اللہ الدہلوی / ۵۳) (امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا گیا کہ جب آپ کا قول کتاب اللہ کے خلاف ہو تو کیا کیا جائے؟ امام صاحب نے فرمایا: کتاب اللہ کو لو، میرے قول کو چھوڑ دو، دریافت کیا گیا جب حدیث آپ کی رائے کے خلاف ہو، آپ نے فرمایا: میرے قول کو چھوڑ دو، حدیث کو لو، پوچھا گیا کہ جب صحابہ کی رائے اس کے خلاف ہو، آپ نے فرمایا: میرے بجائے صحابی کا قول لو)۔

امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے کتاب المیزان میں نقل کیا ہے: "فقد روى الشيخ محی الدين فی الفتوحات المكية بسنده إلى الإمام أبی حنيفه أنه يقول إياكم والقول فی دين الله تعالى بالراي وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل" (کتاب المیزان للشعرانی ۱/ ۵۱) (شیخ محی الدین ابن العربی نے فتوحات مکیہ میں اپنی سند کے ساتھ امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب فرمایا کرتے تھے: تم لوگ اللہ کے دین میں اپنی

رائے سے کوئی بات کہنے سے بچو، تمہارے لئے سنت کی اتباع ضروری ہے، جو شخص سنت کے دائرہ سے باہر نکلے گا، گمراہ ہوگا)۔

غرض کہ فتاویٰ کی جو سنت محمد رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوئی، وہ امین ہاتھوں کے ذریعہ امت تک پہنچی، چنانچہ فقہ کے مدون اول امام ابوحنیفہ کی احتیاط اور ورع وتقوی کی کیفیت کو آپ نے ملاحظہ کرلیا، اسی طرح بے آمیز طریقہ پر ایک نسل سے دوسری نسل تک فقہ وفتاوی کی امانت منتقل ہوتی رہی، جن میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ان کے رفقاء وتلامذہ اور بعد کو چل کر فقہ کی خدمت کرنے اور اسے فروغ دینے والے اہل علم کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

برصغیر میں بھی شروع ہی سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، یہاں ہر دور میں بڑے علماء، اصحاب بصیرت فقہاء، اور زمانہ کے نبض شناس مفتیان کرام پیدا ہوتے رہے ہیں اور انہوں نے بہت ہی بلند پایہ علمی خدمت سرانجام دی ہے۔ فتاوی عالمگیری اور فتاوی تاتارخانیہ جیسی کتابیں اس کی روشن مثال ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً فقہ اسلامی کی خدمت میں احناف کا حصہ زیادہ رہا ہے اور آج نئے مسائل اور واقعات کے حل میں تمام ہی مکاتب فکر فقہاء حنفیہ کی تالیفات سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں، بلکہ بعض لوگ جو ان سے عناد رکھتے ہیں اور ائمہ مجتہدین کے بارے میں بدگمان ہیں، وہ بھی ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔

ہندوستان میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے فقہ وفتاوی کی خدمت کے لئے اللہ تعالی نے خاص طور پر علماء دیوبند کو چن لیا ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا سہول احمد صاحب، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے اکابر نے اس میدان میں جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، اس سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کرسکتا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی (قاضی القضاۃ ونائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ، بانی اسلامک فقہ اکیڈمی وسابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) بھی ہیں۔ برصغیر ہندوپاک، بنگلہ دیش کے موقر ومحبوب علماء میں ان کا شمار تھا

اور ملک وبیرون ملک ان کی علمی بصیرت اور دقت نظر کا اعتراف کیا جاتا تھا، انہیں اپنے اساتذہ کے علاوہ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی صحبت میں رہنے اور ان کی فکر کو جذب کرنے کا موقع ملا، امیر شریعت میں جمود نہیں تھا، وہ حالات وزمانہ پر گہری نظر رکھتے تھے، وسیع النظری کے ساتھ مسائل کو سوچتے تھے، وہ کہتے تھے کہ احکام شرعیہ میں جمود کا مزاج نہیں ہونا چاہیے اور مثال دیتے تھے کہ خود امام ابوحنیفہ کے تلامذہ نے ان سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے، حالانکہ انہیں اپنے استاذ سے سچی عقیدت اور والہانہ محبت تھی اور وہ اصول میں اپنے استاذ کی پیروی کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے مطالعہ میں جہاں وسعت تھی، کتابوں سے اشتغال تھا، وہیں وہ حضرت امیر شریعت کے بافیض صحبت سے بھی فیضیاب تھے، ان دونوں باتوں نے انہیں دقت نظر اور وسعت فکر سے آراستہ کردیا تھا، اور وہ پیش آنے والے مسائل وواقعات میں اس مزاج سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسی لئے ان کے یہاں وسعت نظر ملتی ہے، وہ زمانہ کے حالات پر نگاہ رکھتے تھے اور شریعت کے اصول ومقاصد (جو فقہاء نے مقرر کیے ہیں) کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرتے تھے، اس لئے بعض مسائل اور فتاوی میں ان سے اختلاف رائے ممکن ہے، لیکن ان کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور سلف صالحین کی آراء کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی رائے پیش کرتے ہیں، رہ گئی قاضی صاحب کے فتاوی کی خصوصیات تو عزیز گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد وجنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) نے اس سلسلہ میں بہت تفصیل اور وضاحت سے اپنی اس تحریر میں روشنی ڈالی ہے، جو فتاوی کے اس مجموعہ کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔

قاضی صاحب کا ایک بہت بڑا کام "اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا" کا قیام اور اس کے زیر اہتمام فقہی سمیناروں کے انعقاد کا سلسلہ ہے، اس نے ہندوستان کے علماء اور نوجوان فضلاء میں علم وتحقیق کی ایک نئی تحریک پیدا کی ہے، نئے مسائل کی طرف ارباب افتاء کی توجہ دلائی ہے اور اجتماعی غور وفکر کا ماحول بنایا ہے، مجھے یاد ہے کہ پہلے فقہی سمینار میں خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

نے خطبۂ صدارت پیش کیا تھا، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے افتتاحی خطبہ دیا تھا اوران حضرات نے اور دوسرے بزرگ شرکاء نے اس عمل کی تحسین فرمائی تھی، قاضی صاحبؒ کی یہ خدمت تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی اور کوئی صاحب انصاف اس کے دوررس اثرات اور مفید نتائج سے انکار نہیں کر سکے گا، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان سمیناروں کے انعقاد میں ابتدائی مرحلہ میں محترم ڈاکٹر منظور عالم صاحب کا نمایاں حصہ رہا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد اکیڈمی کی ذمہ داری ہم لوگوں کے کمزور کاندھوں پر آپڑی ہے، اس امانت کا حق اسی وقت ادا ہو سکے گا جب امت کے مختلف حلقوں کے لوگ اپنی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق اس اہم کام کا تعاون کریں، حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد منعقد ہونے والے اس پہلے فقہی سمینار کے موقع سے ان کے فتاوی کا مجموعہ پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے، انشاء اللہ ان کی دوسری غیر مطبوعہ تحریریں بھی بتدریج منظر عام پر آئیں گی اور لوگ اس سے نفع اٹھائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام وتام عطا فرمائے، اس کو مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، اوران کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے، ربنا اغفر ولنا لاخواننا الذین سبقونا بالإیمان۔

محمد ظفیر الدین مفتاحی

(مفتی دار العلوم دیوبند، وصدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ، ۱ رجون ۲۰۰۴ء

پیش لفظ

(حضرت مولانا بدر الحسن القاسمی، کویت)

''مفتی'' کا مقام بڑا بلند اور ''فتویٰ نویسی'' کا کام بڑی ذمہ داری کا کام ہے، رب کائنات نے قرآن کریم میں ''افتاء'' کی نسبت خود اپنی ذات کی طرف کی ہے، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: "یَسْتَفْتُوْنَکَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِیْھِنَّ" (النساء: ۱۲۷) (وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے)۔

دوسرے موقع پر کہا گیا ہے: "وَیَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِي الْکَلَالَۃِ" (النساء: ۱۷۶) (وہ آپ سے سوال کر رہے ہیں، آپ کہد یجیے کہ کلالہ کے بارے میں اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے)۔

امام ابن القیمؒ کے بقول مفتی درحقیقت احکام الٰہی کے بیان میں رب کائنات کا ترجمان اور اس کی نیابت میں دستخط کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جب دنیا کے بادشاہوں کی طرف سے دستخط کرنے والا بلند رتبہ تصور کیا جاتا ہے تو رب کائنات اور خالق ارض وسماوات کی نیابت میں دستخط کرنے والا کتنے بلند مقام کا حامل ہوگا، اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے، اسے علم وفضل میں کمال کے ساتھ تقویٰ وطہارت کی دولت سے بہرور اور علمی امانت واحتیاط کے وصف سے بھی سرفراز ہونا چاہیے۔

علامہ ابن القیمؒ کے الفاظ میں: "فکیف بمنصب التوقیع عن رب الأرض

والسماوات، فحقيق بمن أقيم في هذا المنصب أن يعدّ له عدّته ويتأهب له أهبته وأن يعلم قدر المقام الذي أقيم فيه" (اعلام الموقعین ۱/۹) (جب بادشاہوں کی نیابت کرنے والوں کا یہ مقام ہے تو پھر زمین وآسمان کے رب کی نیابت کرنے والے کا مقام کیا ہوگا، چنانچہ جس شخص کو اس مقام پر فائز کیا جائے اس کو اس کے لئے بھرپور تیاری کرنی چاہیے اور اس کے لئے درکار علم وکمال سے بہرور ہونا چاہیے اور جس مقام پر وہ ہے اس کی اہمیت کا ادراک کر لینا چاہیے۔)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: "وليعلم المفتي عمن ينوب في فتواه وليوقن أنه مسئول غدا وموقوف بين يدي الله" (اعلام الموقعین ۱/۹) (اور مفتی کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے فتوے میں کس کی نیابت کر رہا ہے اور یقین کر لینا چاہیے کہ کل اس سے اس کے بارے میں بازپرس ہوگی اور اسے اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ دین کا گہرا علم رکھنے اور نورِ نبوت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کے باوجود فتویٰ دینے کی ذمہ داری سے خود کو عام طور پر سبکدوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے شرکائے بدر میں تین سو افراد کو دیکھا ہے کہ جب ان سے کوئی دینی سوال کیا جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کے بجائے کوئی دسرا جواب؛

ابن لیلیٰ کہتے ہیں کہ: میں نے انصارؓ میں ایک سو بیس افراد کو دیکھا ہے جن میں سے ہر ایک فتویٰ کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کرتا تھا (المجموع شرح المہذب ۱/۶۸)۔

امام مالکؒ کا ارشاد ہے: "من أجاب في مسألة فينبغي قبل الجواب أن يعرض نفسه على الجنة والنار وكيف خلاصه في الآخرة وثم يجيب" (المجموع شرح المہذب ۱/۶۹) (جو کوئی کسی شرعی مسئلہ کا جواب دے اسے جواب دینے سے پہلے خود کو جنت اور دوزخ پر پیش کر لینا چاہیے کہ آخرت میں اس کی رستگاری کس طرح ہوگی، پھر وہ جواب دے)۔

بعد کے زمانہ میں فتویٰ کے بارے میں بے احتیاطی کا ذکر کرتے ہوئے ابو حصین الأسدی

کہتے ہیں: "إن أحدهم ليفتي في المسالة ولو وردت على عمر بن الخطاب لجمع لها أهل بدر" (المجموع شرح المہذب ۱/۶۹) (بعض لوگ ایسے مسئلہ کا جواب بے دھڑک دے دیا کرتے ہیں جو اگر حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ جواب دینے کے لئے تمام شرکائے بدر کو اکٹھا کر لیتے)۔

سلف کے یہاں ذمہ داری کے اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ بہت سے علماء اینچ پیچ سے جواب دینے کے بجائے بڑی صفائی سے کہہ دیا کرتے تھے کہ "لا أدري" مجھے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے۔

مشہور ہے کہ امام مالکؒ سے ۴۸ مسئلے پوچھے گئے جن میں ۳۲ کے بارے میں انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور جب ایک مسئلہ کے بارے میں ان کے لاعلمی ظاہر کرنے پر کسی نے کہا کہ یہ تو بڑا آسان مسئلہ ہے تو سخت ناراض ہو کر فرمانے لگے: "ليس في العلم خفيف أما سمعت قول الله تعالىٰ: "إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا" (المزمل:۵) "فالعلم كله ثقيل خاصة ما يسئل عنه يوم القيامة" (علم میں کوئی چیز ہلکی اور آسان نہیں ہے، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا کہ: ہم عنقریب تم پر وزنی کلام اتاریں گے۔ لہٰذا ہر علم مشکل اور باوزن ہے، خاص طور پر وہ باتیں جن کے بارے میں قیامت میں پرسش ہوگی)۔

اسی طرح امام شعبیؒ سے کسی نے کہا کہ آپ فقیہ عراق سمجھے جاتے ہیں اس کے باوجود آپ کو لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تو کہنے لگے: "لكن الملائكة لم تستح حيث قالت: لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" (البقرہ:۳۲) (میں کیوں شرم کرتا جبکہ فرشتے بھی یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں شرمائے کہ ہمیں اتنا ہی معلوم ہے جتنا آپ نے سکھلا دیا ہے، اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے)۔

جہالت کے باوجود فتویٰ دینے میں جرأت تو اس زمانے میں عام ہو گئی ہے، حالانکہ فقہاء نے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

امام ربیعہ کا قول ہے: "بعض من يفتي أحق بالسجن من السراق" (المدخل لابن بدران / ۱۹۵) (بعض فتویٰ دینے والے، چوروں کے مقابلہ میں زیادہ جیل میں ڈالے جانے

کے مستحق ہیں)۔

موجودہ زمانہ میں ''فتویٰ نویسی'' کا کام اور بھی پیچیدہ اور مشکل ہوگیا ہے، کیونکہ ایک طرف جدید بے لگام تمدنی ترقی نے نئے مسائل کا طوفان لاکر کھڑا کردیا ہے اور بقول خلیفۂ راشد عمر بن عبد العزیز: ''کلما زاد الفجور کثرت المسائل'' (جس قدر فسق وفجور میں اضافہ ہوگا مسائل بھی اسی قدر بڑھتے جائیں گے)۔

ٹیوب ٹیسٹ بے بی، انسانی دودھ اور منی کے بینکوں، اعضائے تناسل کی سرجری کے ذریعہ تبدیلی، جینٹک انجینئرنگ سے وابستہ اور کلوننگ کے مسائل اس کی مثالیں ہیں۔

دوسری طرف دنیا کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظام روزمرہ کی تبدیلیوں اور خاص طور پر بینکنگ اور میڈیکل سائنس کی دنیا میں غیر معمولی انقلاب نے سیکڑوں ایسے مسائل پیدا کردیے ہیں جن کا اب سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس لحاظ سے علمائے دین اور ارباب افتاء کی ذمہ داریاں بھی بیحد بڑھ گئی ہیں، چنانچہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ فتویٰ دینے والے اداروں میں باہم ربط وہم آہنگی ہو، تاکہ فتووں میں تضاد کو کم کیا جاسکے۔

کسی بھی مسئلہ کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنا ضروری ہے، اسی لیے امام ابو یوسفؒ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا: "من لا یعرف أحوال زمانه لم یجز لـه الفتیا" (جس شخص کو اپنے زمانہ کے احوال کا علم نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا بھی جائز نہیں ہے)۔

اس لئے بینکنگ اور میڈیکل سائنس کے پیچیدہ مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے اور حل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ علماء کے ساتھ ماہرین اقتصادیات اور ڈاکٹروں کی مشترکہ نشست ہو، تاکہ مسئلہ کا ہر پہلو واضح ہوسکے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے جو پیچیدہ تمدنی مسائل ہیں ان کے لئے انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی بحث وتحقیق کا نظام زیادہ بہتر اور غلط رائے دہی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے

اور اس بات کا احساس عالمی طور پر لوگوں کو ہے، اسی لئے مختلف فقہی اکیڈمیاں وجود میں آئیں جن میں تنظیم اسلامی کانفرنس کے ماتحت کام کرنے والی ''اسلامی فقہ اکیڈمی''، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے زیر انتظام قائم ''فقہ اکیڈمی'' اور خود مولانا مجاہد الاسلام قاسمی مرحوم کی قائم کردہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مغربی ممالک میں قائم شدہ ''یورپی کونسل برائے افتاء وتحقیق'' کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، گوکہ اس کی عمر ابھی تھوڑی اور اس کے جاری کردہ فتووں کی تعداد بھی کم ہے، لیکن بڑی نزاکت لیے ہوئے ہیں اور بعض فتووں سے اتفاق کرنا بھی مشکل ہے۔

ان کے علاوہ کویت کی ''اسلامی تنظیم برائے طبی علوم'' نے بھی گذشتہ چند برسوں میں بعض اہم اور نازک جدید طبی مسائل پر فقہاء اور اطباء کے مشترکہ سیمناروں کے ذریعہ اہم خدمت انجام دی ہے، سوڈان میں بھی فقہ اکیڈمی قائم ہوگئی ہے اور مصر کے اسلامی امور کی سپریم کونسل اور دار الافتاء کی طرف سے بھی مختلف نئے مسائل کے بارے میں نقطۂ نظر کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ایک بات قابل توجہ یہ بھی ہے کہ برصغیر میں اب تک روایتی فتویٰ نویسی کا نظام قائم ہے جس کی رو سے افتاء کا ایک متعینہ کورس پورا کرنے کے بعد ایک عالم دین کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے سوالات کے جوابات اور حلال وحرام کے بارے میں فتوے دے۔

اس نظام میں طہارت، نماز، روزے، زکاۃ، نکاح وطلاق، وقف اور میراث وغیرہ سے متعلق انفرادی طور پر لوگوں کو پیش آنے والے مسائل کے بارے میں رہنمائی کی جاتی ہے اور فتووں کا وزن مفتی کے علم وفضل میں شہرت وعظمت سے جڑا ہوتا ہے اور مفتی کی ذمہ داری پیش آمدہ مسئلہ میں فقہائے متاخرین کی کتابوں خاص طور پر علامہ ابن عابدین کی شامی، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ بزازیہ وغیرہ سے جزئیہ نقل کردینے سے پوری ہوجاتی ہے، اس نظام میں مفتی کا کام صرف نقل ہے، نہ فقہاء کے اقوال میں ترجیح اور نہ دلائل کا ذکر اس کی ذمہ داری ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور کویت وغیرہ میں ''فتویٰ نویسی'' کا کام فرد واحد کے بجائے علماء کی

ایک کمیٹی کے سپرد ہوتا ہے اور مسلکی پابندی کا عام رجحان نہ ہونے کی وجہ سے دلائل کا ذکر اور مختلف اقوال میں ترجیح کا طریقہ بھی بسا اوقات اختیار کیا جاتا ہے یا فتویٰ کو ایک قرارداد کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ان طریقوں میں سے ہر ایک نظر ثانی کا محتاج ہے۔ پہلے طریقہ میں عرف اور حالات سے قطع نظر بعض دفعہ ایسے فتوے سامنے آتے ہیں جو حیرت کا سبب بنتے ہیں اور ایک خاص ماحول میں لکھی ہوئی عبارت نص شارع کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، جبکہ دوسرے طریقہ میں کسی متعینہ منہج کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ اصول کی خلاف ورزی ہو جایا کرتی ہے اور اجتہاد کے زعم میں بعض ایسے فتوے سامنے آتے ہیں جو ''انضباط'' کے بجائے ''انفلات'' کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس حقیقت کو بھی کہ حضرت مولانا تھانویؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مفتی مہدی حسن شاہجہانپوریؒ جیسی فقہی بصیرت رکھنے والی شخصیات منصب افتاء کی زینت بخشنے کے لئے اب خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں اور وقف اور زکاۃ جیسے امور میں بھی اب بعض ایسے پیچیدہ مسائل سامنے آتے ہیں جن کو حل کرنے کے لئے ایک سے زائد علماء کی فقہی بصیرت درکار ہوتی ہے، اس لئے ہر مستند دار الافتاء میں مسائل کی تقسیم کا ایک لائحۂ عمل تیار ہونا چاہے، نماز، روزے اور طلاق وغیرہ سے متعلق روزمرہ کے سوالات کے جوابات تو انفرادی طور پر مفتی صاحبان لکھا کریں، لیکن ایسے مسائل جو نئے اور پیچیدہ ہوں مثال کے طور پر انشورنس، اسٹاک ایکسچینج، اوقاف اور زکاۃ کے اموال کی سرمایہ کاری بینکوں میں رائج مختلف قسم کے کریڈٹ اور دیگر اقسام کے کارڈ وغیرہ، قبضہ کی نئی شکلیں، اسی طرح موجودہ زمانہ کی پیچیدہ اور غیر واضح سیاسی صورت حال میں دار الحرب اور دار الاسلام وغیرہ کی تقسیم سے متعلقہ سوالات کا جواب لکھنے کے لئے علماء کی اور ارباب افتاء کی مجلس تشکیل دی جائے جو مکمل تحقیق کے بعد باہمی صلاح ومشورے سے ان چیزوں کا شرعی حکم بیان کرے۔

برصغیر کے نامور علماء کے فتاوے کے مجموعوں کے علاوہ مصر، سعودی عرب اور کویت وغیرہ

سے شائع شدہ فتووں کے مجموعوں پر نظر رکھنا بھی مفتیان کرام کے لئے ضروری ہے، عرب دنیا کے ارباب افتاء میں سے اگر بعض، تصویر کشی، سنیما بینی اور موسیقی وغیرہ کے بارے میں آزادانہ رجحان رکھتے ہیں تو ایسے اہل علم کی بھی کمی نہیں ہے جو ان امور میں نہ صرف محتاط بلکہ ایک حد تک سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ائمہ مذاہب اور دیگر فقہائے امت کے خلاف ایک چھوٹے سے گروہ کی ہرزہ سرائی سے قطع نظر مختلف فقہی مذاہب کے علماء کے درمیان مصنوعی حد بندیاں ختم ہوگئی ہیں اور تمام مذاہب سے استفادہ کا رجحان اہل علم میں بڑھ گیا ہے، چنانچہ خود سعودی عرب کے "هيئة كبار العلماء" کا مسائل کے بارے میں انداز تحقیق یہ ہے کہ پہلے ہر مسئلہ کے بارے میں مذاہب اربعہ کی کتابوں سے ہر ایک کا نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ نقل کیا جائے، پھر ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دی جائے۔

''طلاق ثلاثہ''، پوسٹ مارٹم اور اعضاء کی پیوندکاری وغیرہ کے مسائل پر "هيئة كبار العلماء" کی غیر جانبدارانہ تحقیق کو دیکھا جا سکتا ہے۔

برصغیر میں سواد اعظم فقہ حنفی کے پیروکار ہے، جبکہ سعودی عرب کی تعلیم گاہوں اور عدالتوں میں فقہ حنبلی کو فوقیت حاصل ہے، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں فقہ شافعی، مالکی اور حنفی قدم بہ قدم ہیں۔

جبکہ تیونس، الجزائر، مراکش اور موریتانیہ وغیرہ میں اکثریت فقہ مالکی پر عمل کرنے والوں کی ہے، لیکن ضرورت پڑنے پر ایک مسلک کے ماننے والوں کا دوسرے مسلک کے کسی جزئیہ پر عمل کرنے کی گنجائش اکابر اہل علم نے تسلیم کی ہے اور سب سے اچھی اور زندہ مثال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة'' ہے، جس میں آپ نے ضرورت کی بنا پر مسئلہ کی مکمل تحقیق وتنقیح کرنے کے بعد فقہ مالکی پر عمل کو اختیار فرمایا ہے۔

فتویٰ کے بارے میں یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ایک طرف ارون شوری جیسے اسلام اور مسلمانوں سے پرخاش رکھنے والے لوگوں نے ''فتووں کی دنیا'' کو چیلنج کیا

ہے تو دوسری طرف ناپختہ علم رکھنے والے خودرو قسم کے مفتیوں نے جان و مال اور عزت وآبرو کی حرمت اور شریعت کے بنیادی مقاصد کا لحاظ کیے بغیر انتہائی نازک مسائل میں فتووں کی بھرمار کردی ہے جن کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کا خون ارزانی کے ساتھ بہہ رہا ہے اور سارا عالم اسلام ہی دشمنوں کے نرغہ میں ہے۔

ایسے ماحول میں بابصیرت علماء کا فریضہ ہوجاتا ہے کہ وہ فتوے کی زمام اپنے ہاتھوں میں لیں اور تمام اہم اور نازک مسائل میں امت کی رہنمائی کریں۔

برصغیر کی تاریخ میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ماہر مفتی پیدا ہوئے ہیں اور قریب کے زمانہ میں جن لوگوں پر فتویٰ کا مدار رہا ہے، ان میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا انوار اللہ خاں حیدرآبادیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ امتیازی شان کے حامل رہے ہیں۔

جہاں تک مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا تعلق ہے تو ان کی شناخت ''قاضی شریعت'' کی حیثیت سے رہی ہے اور قضا کے مسائل پر ان کو بڑا درک حاصل تھا، قدرت نے انہیں فطری ذکاوت وذہانت اور بے مثال عبقریت کے ساتھ غیر معمولی فقہی بصیرت عطا کی تھی اور قضا کا پیرہن ہر لحاظ سے ان پر چست تھا، چنانچہ قضاء مقدمات اور فصل خصومات میں ان کی معاملہ فہمی، دقت نظر اور سرعت ذہنی کو دیکھ کر بسا اوقات خیر القرون کے قاضی شریحؒ اور ایاس بن معاویہؒ وغیرہ کی یاد تازہ ہوجایا کرتی تھی۔

''افتاء'' کا دائرہ ''قضا'' سے الگ اور ''مفتی'' کا منصب ''قاضی'' کے منصب سے جداگانہ ہے، لیکن دونوں کے لئے جو چیز قدرِ مشترک کے طور پر درکار ہے وہ ''تفقہ فی الدین'' اور شرعی نصوص اور فقہی اصول وکلیات کو روزمرہ کے واقعات وحالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت ہے جس میں قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی اپنے بہت سے معاصر علماء پر فوقیت رکھتے تھے۔

امارت شرعیہ میں ان کی زندگی یوں تو قضا کے تقاضوں سے ہی جڑی رہی، لیکن ضرورت

پڑنے پر فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دینے سے بھی انہوں نے گریز نہیں کیا، ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' میں شائع شدہ بعض فتووں پر ان کے تحقیقی حاشیوں اور ''بحث ونظر'' میں شائع شدہ متفرق فتووں سے بھی ان کی فتویٰ نویسی میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، البتہ زندگی کے آخری سالوں میں فقہ اکیڈمی، ملی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرمیاں ان کی زندگی کا اصل حصہ بن گئیں اور ان کی زندگی کے یہ سال بڑے بافیض اور بارآور گزرے اور متعدد اہم کارنامے اپنی مسلسل علالت کے باوجود اسی زمانے میں انہوں نے انجام دیئے۔ ''صنوان القضا وعنوان الإفتاء'' کی تحقیق وتعلیق بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے جسے کویت کی وزارت اوقاف نے بڑے آب وتاب سے شائع کیا ہے، خاص طور پر ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' ان کی زندگی کا شاہکار ہے، اس نے ملت میں ایک نئی روح پھونکی، علما کے سوچنے کا نہج بدلا اور فقہی موضوعات پر بصیرت کے ساتھ کام کرنے والے علما کی ایک ٹیم تیار کردی ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کی ہمہ جہت دینی، ملی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے ان کے بہت سے اوصاف کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھا، ''فتویٰ نویسی'' بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ خوش قسمت اور لائق مبارکباد ہیں مولانا امتیاز احمد قاسمی جنہوں نے ان کے بظاہر بے نشان فتووں کو اکٹھا کرکے ایک مجموعہ تیار کردیا ہے۔ فقہ اکیڈمی کی طرف سے اس کی اشاعت قاضی صاحب کے ساتھ وفاداری اور اکیڈمی کی زندگی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحب فتویٰ کو جنت نصیب کرے اور ان کے فتووں کا یہ مجموعہ قبولِ عام حاصل کرے اور عوام وخواص سبھوں کے لئے نشان راہ ثابت ہو، آمین۔

بدر الحسن القاسمی، مقیم کویت

(نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۲۷/۵/۲۰۰۲ء

حضرت قاضی صاحبؒ کے فتاویٰ اوران کی خصوصیات

(حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور جامع ترین شخصیت تھی، وہ قلب ودماغ کو فتح کرنے والے خطیب تھے، ان کا اسلوب تحریر ایسا تھا جو دلوں کو چھو لیتا تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ ملکی وملی مسائل میں ان کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کا عجیب ذوق عطا فرمایا تھا اور حدیث سے ان کو خاص شغف تھا۔ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور سیرت نبوی کے واقعات سے استنتاج کا ایسا ملکہ تھا کہ کم لوگوں میں اس کی نظیر دیکھنے میں آئی۔ لیکن جو علم ان کی پہچان اور شناخت بن گیا تھا وہ ہے فقہ اسلامی۔ وہ اس فن کے غواص تھے اور ان کے اندر یہ ذوق اس درجہ عالی اور بلند تھا کہ وہ بہت سے مسائل پر کتابوں کی طرف مراجعت کئے بغیر جو رائے دیتے بالآخر وہی درست، کتاب وسنت کے مزاج سے قریب اور سلف صالحین کے اجتہادات سے ہم آہنگ رائے ثابت ہوتی۔

فقہ کے موضوع پر ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انہوں نے کم وبیش چالیس سال امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ میں قضا کا فریضہ انجام دیا۔ فقہ کے موضوع پر انہیں لکھنے کا موقع کم ملا لیکن جس موضوع پر قلم اٹھایا، کہنا چاہیے کہ اس کا حق ادا کیا۔ اس کی مثال ''اسلامی عدالت''

ہے۔ ان کا سب سے نمایاں کام فقہ وقضا کے میدان میں افراد سازی اور رجال کار کی تیاری، نیز اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جیسے عظیم الشان ادارہ کی تشکیل بلکہ ایک فقہی وعلمی تحریک کی تاسیس تھی۔

عملی طوران کا سب سے وسیع فقہی سرمایہ وہ فیصلے ہیں جوانہوں نے دار القضاء امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ سے صادر فرمائے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو قضا میں جودرک حاصل تھا وہی رنگ وآہنگ افتاء کے باب میں بھی تھا، چونکہ فقہاء کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ قاضی فتویٰ دے سکتا ہے یانہیں؟ یاعام مسائل میں دے سکتا ہےاوران مسائل میں نہیں، جن میں فریقین کے دارالقضا سے رجوع کرنے کا امکان ہو؟ کیونکہ اگر متعلقہ شخص کو کسی مسئلہ کے بارے میں پہلے سے قاضی کی رائے معلوم ہوجائے تو ممکن ہے کہ وہ اسی کے مطابق دعویٰ کرے اوراسی لحاظ سے گواہان تیار کرے، اس لئے ایک گروہ نے قاضی کو مطلقاً اور بعض نے امکانی طور پراس کی عدالت میں آنے والے مسائل کی بابت قاضی کوفتویٰ دینے سے منع کیا ہے۔

بحیثیت قاضی فتویٰ دینے میں احتیاط

قاضی صاحب امور قضاء میں حد درجہ محتاط تھےاورقریب سے قریب شخص کا کوئی معاملہ ہو، اگردار القضاء میں آجاتا تو مجال نہ تھی کہ وہ قبل از وقت اس مقدمہ میں قاضی صاحب کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہوجائے اور ممکن نہ تھا کہ فیصلہ پران تعلقات کا کوئی اثر پڑے، اسی پس منظر میں آپ عام طور پرفتویٰ نہیں دیا کرتے تھے، یا جوفتاویٰ لکھاتے ان پراپنے دستخط نہیں کرتے تھے، اس لئے دار الافتاء امارت شرعیہ کے ریکارڈ میں آپ کے بہت سے فتاویٰ مختلف مفتیان کرام کے دستخطوں کے ساتھ محفوظ ہیں اورظاہر ہے کہ اب ان کی شناخت دشوار ہے۔

بعض ایسے مسائل سامنے آتے تھے جن سے دوفریق کا تعلق ہواوردونوں تیار ہوتے تھے کہ قاضی صاحب کے فتویٰ پرہم عمل کریں گے، یاایسے مسائل ہوتے تھے جن کے دارالقضاء تک آنے کی توقع نہیں ہوتی، اسی طرح اخیر کے سالوں میں جب آپ بہت کم محض چند اہم قسم کے مقدمات کے فیصلے لکھاتے تھے تواس دور میں استفتاء کا جواب بھی دیا کرتے تھے، افسوس کہ ان فتاویٰ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا جاسکا۔

مدارج احکام کی رعایت

قاضی صاحب کے فتاویٰ پرغور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ احکام کے مدارج کا بہت لحاظ فرماتے تھے، منصوص واجماعی مسائل اور اجتہادی واختلافی مسائل میں فرق کرتے تھے، منصوص اوراجماعی مسائل میں آپ نص اوراجماعی رائے سے ذرا بھی تجاوز کو گوارہ نہیں فرماتے تھے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے ایک استفتاء مصارف زکوۃ کے سلسلہ میں آیا، ان حضرات نے پہلے جامعہ ازہر سے فتویٰ منگایا تھا، ازہر کے ارباب افتاء نے زکوۃ سے ایسے علاقوں میں مساجد ومدارس کی تعمیر کی اجازت دی تھی جہاں مسلمان غربت کی وجہ سے مسجد تعمیر کرنے پر قادر نہیں ہیں، قاضی صاحب نے واضح طور پراس جواب سے اختلاف کیااوراپنے جواب میں تحریر کیا:

> باجماع ائمہ اربعہ مساجد ومدارس کی تعمیر، سڑک کی مرمت وغیرہ جیسے کاموں میں زکوۃ خرچ نہیں کی جاسکتی، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اس کی وجہ تملیک کا فقدان ہےاوردیگر ائمہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ "فی سبیل اللہ" کی تعریف میں یہ داخل نہیں ہے، جہاں تک مدارس کے طلبا کی کفالت کا تعلق ہے، اگر وہ محتاج ہیں تو ان پر زکوۃ خرچ کی جاسکتی ہے، اسی طرح مصیبت زدہ پریشان حال مسلمان اگر محتاج ہیں توانہیں زکوۃ بے تکلف دی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ایک خاتون نے جسے نکاح کے آٹھ سال بعد حمل ٹھہرا تھا اور حمل پر پانچ ماہ کی مدت گذر چکی تھی، ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق اس بات کا غالب امکان تھا کہ نومولود دماغ وجسمانی مریض ہوگااورایک سال کے اندراس کی موت واقع ہوجائے گی، اس لئے والدین چاہتے تھے کہ حمل ساقط کرادیا جائے، آپ نے اپنے فتویٰ میں اس سے سختی سے منع کیااورفرمایا کہ یہ ایک زندہ یقینی وجود کو متوقع خطرہ کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتاردینا ہے، پھرآپ نے آگے مختلف فقہاء کے حوالہ سے لکھا کہ بچہ میں جان آنے کے بعد اسقاطِ حمل حرام ہےاوراس پراجماع ہے۔

احوال زمانہ کالحاظ

لیکن جو مسائل مجتہد فیہ اور اختلافی ہوتے یا جن میں حالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں تغیر کی ضرورت پیش آتی وہاں اس رعایت کو بھی ملحوظ رکھتے، ایسے کئی فتاویٰ آپ کے موجود ہیں، مثلاً ایک صاحب نے جہیز کے بارے میں سوال کیا اور اس سلسلہ میں حضرت فاطمہؓ کو جو رسول اللہ ﷺ نے چند چیزیں دی تھیں، اس سے استدلال کیا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ دیا اس کے لئے نہ حضرت علیؓ کا مطالبہ تھا، نہ سماج کا کوئی دباؤ اور وہ بھی اس پس منظر میں تھا کہ حضرت علیؓ آپ ہی کے زیر پرورش تھے، اس لئے اسے سنت قرار دینا درست نہیں، آپ نے فتویٰ کے اخیر میں اس سماجی برائی پر نکیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سرمایہ اور نمائش کے لئے اپنی بیٹیوں کو بہت کچھ دے کر دوسرے غریب لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے ہیں، اسلام نمائش کی بھی اجازت نہیں دیتا، ان حالات میں جو جہیز مسنون ہے اس میں اور جو جہیز مروج ہے اس میں صرف لفظ کا اشتراک ہے، حقیقت دونوں کی بالکل علاحدہ ہے، لہٰذا مروجہ جہیز کو سنت قرار دینا بالکل صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ قطعی طور پر ناجائز رواج ہے، جس کے مٹانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

آج کل اوقاف کی بہت ساری زمینیں ضائع ہو رہی ہیں اور جو ویران اراضی وقف ہیں وہ ناجائز تصرف میں آجاتی ہیں، اسی پس منظر میں وقف کی بعض اراضی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے کارآمد بنانے کے نقطۂ نظر سے بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ نے ایک استفتاء بھیجا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں جو فتویٰ لکھا، اس میں احتیاط بھی ہے، وقف کے مفادات کا تحفظ بھی اور حالات کی رعایت بھی، چنانچہ رقم طراز ہیں:

> قبرستان اگر پرانا ہو چکا ہے اور مدتوں سے اس میں تدفین عمل میں نہیں آرہی ہے اور نہ بظاہر حال مستقبل قریب میں تدفین کے مصرف میں اس کے استعمال کا امکان ہے، تو ایسی صورت میں قبرستان کی زمین کا وہ حصہ جس میں پہلے تدفین عمل میں نہیں آئی ہے اور نہ وہاں قبروں کے آثار ہیں اور اسی طرح وہ حصہ جس

> میں بھی تدفین عمل میں تو آئی ہے لیکن قبریں اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ ان میں ہڈیاں بھی مٹی بن گئی ہوں گی، ایسی زمین پر مدرسہ بنانا، مسجد بنانا، یا کسی ایسی عمارت کی تعمیر جو مسلمانوں کے افادہ عام کی ہو، یا جس کی آمدنی مسلمانوں کے زیر انتظام مصارف خیر پر خرچ کی جاسکے جائز ہے، عینی شرح بخاری میں ہے: "قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا الخ" (۱/۵۹۹) — مندرجہ بالا اصولی حکم کی روشنی میں قبرستان فقیر باڑہ وقف نمبر ۷۶۵ کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

عرف کی رعایت

اسی طرح عرف وحالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں جو فرق واقع ہوتا ہے، قاضی صاحب کے فتاویٰ میں اس کا بھی لحاظ ہوتا تھا، مثلاً بیوی کے علاج کا مسئلہ ہے، قاضی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ نفقہ میں علاج بھی داخل ہے اور اس سلسلہ میں فقہاء کی ان عبارتوں سے استدلال کیا ہے، جو نفقہ کی تعریف سے متعلق ہیں، قاضی صاحب نے اپنے ایک فتویٰ میں بھی مختصر الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

> آج کے بدلے ہوئے حالات میں دوا، علاج ضروریات زندگی میں سے ہے اور موجودہ عرف عام میں بھی شوہر کے ذمہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے کھانا، کپڑے کے ساتھ ساتھ دوا، علاج کا خرچ بھی شوہر کے ذمہ عائد ہوگا۔

قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ اور مسائل کی تحقیق میں اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ سلف کے اقوال کا تتبع کیا جائے، وہ کہتے تھے کہ ہماری کتب فقہ اتنی جامع ہیں اور ہمارے بزرگوں نے ایسی کاوشیں کی ہیں کہ کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل ان کتابوں میں موجود نہ ہو، لیکن ضرورت گہرے مطالعہ اور فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اصول وقواعد کو سمجھنے کی ہے، اسی پس منظر میں وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے تھے کہ اقوال کے مصداق اور افعال کے منشا کو جاننے کے لئے اپنے عہد کے عرف

کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے لئے صرف گذشتہ فقہاء کی عبارتوں پر ان کے پس منظر کو جانے بغیر انحصار کر لینا مناسب نہیں۔

اس کی بہت سی مثالیں ان کی آراء میں موجود ہیں، مثلاً اس سوال پر کہ ''باپ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے سونا چاندی کے زیورات وغیرہ خرید لے تو اس کی زکوٰۃ باپ پر واجب ہوگی یا بیٹی پر؟'' فرماتے ہیں:

> باپ بیٹی کی شادی کی نیت سے زیورات بنوائے یا روپیہ جمع کرے، ایسی چیزیں عام طور پر شادی سے پہلے باپ ہی کی ملکیت تصور کی جاتی ہیں، ہبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ شی موہوب لہ کی ملکیت اور قبضہ میں آجائے اور اس کو تصرف کرنے کا اختیار ہو، اس لئے اس طرح کی جمع رقوم اور زیورات باپ ہی کی ملکیت تصور کئے جائیں گے اور اس کی دیگر املاک کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی

جیسے ایک قاضی کسی واقعہ کو بہت ہی دقت نظر کے ساتھ دیکھ کر اور پوری گہرائی سے اور غور کر کے فیصلے کرتا ہے، قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی کی یہ کیفیت اور قوت فیصلہ نمایاں نظر آتی ہے، مثلاً ایک افتادہ سرکاری زمین پر عیدگاہ تعمیر ہوئی، اب سوال یہ ہوا کہ یہاں مسجد بنائی جاسکتی ہے؟ جبکہ سرکار کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں کوئی صریح اجازت نامہ نہیں ہے، ایسی صورت میں کیا یہ ارض مغصوبہ پر مسجد کی تعمیر نہیں سمجھی جائے گی؟ قاضی صاحب نے مسلمانوں کے تصرف کے باوجود حکومت کی طرف سے کوئی اعتراض نہ کئے جانے کو دلالۃً اجازت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین افتادہ تھی جس میں آج سے ۴۰ سال پہلے عیدگاہ تعمیر ہوئی اور آج تک یہ اراضی مسلمانوں کے قبض ودخل میں چلی آرہی ہے، کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، زمین گھری

> ہوئی چہار دیواری کے اندر ہے، پس قبض ودخل مکمل ہے، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں، بلکہ زمین حکم اراضی موات کی تھی، ظاہر حال یہ ہے کہ اجازت سے عیدگاہ بنائی گئی اور اس طویل قبض ودخل اور بصورت عیدگاہ زمین کی ہیئت عام افتادہ اراضی سے بدل چکی ہے، اسی صورت میں اس پر مسجد بنائی جاسکتی ہے، البتہ مناسب ہے کہ آئندہ کے رفع شر کے لئے اس کی بندوبستی کرالی جائے۔

ایک واقعہ میں ایسا ہوا کہ لڑکے کے والدین نے اولاً طلاق سے انکار کیا اور بعد میں دعویٰ کرنے لگے کہ لڑکے نے طلاق دے دی تھی، قاضی صاحب نے اس سلسلہ میں جو فتویٰ دیا ہے وہ کسی مسئلہ پر گہرائی کے ساتھ غور وخوض کی بہترین مثال ہے:

> چونکہ لڑکے کے والد اور والدہ نے اولاً طلاق سے انکار کیا، یعنی اگر واقعہ صحیح تھا تو جھوٹ بولا، یا حق کو چھپایا اور بھائی جو مولوی صاحب ہیں، انہوں نے بھی بروقت شہادت نہیں دی اور شہادت میں تاخیر کی اور یہ معاملہ امور حسیہ دینیہ میں سے ہے اور ایسے معاملہ کو چھپانا یا شہادت میں تاخیر کرنا یا جھوٹ اور الٹا بیان دینا، خود شاہدین کے بیان کے مطابق ان کے لئے موجب فسق ہے، لہٰذا یہ لوگ فاسق قرار پاتے ہیں اور فاسق کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اس لئے ان لوگوں کے بیان سے طلاق ثابت نہیں مانی جائے گی، اب شوہر سے قسم پنچوں کے سامنے لے لی جائے، اگر وہ یمین کے ساتھ طلاق کا انکار کرے تو طلاق واقع نہیں مانی جائے گی، ہاں اگر شوہر اقرار کرے یا قسم کھانے سے انکار کرے تو طلاق ثابت مانی جائے گی۔

ایک شخص نے نفقہ کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے دعویٰ کر دیا کہ اس نے دو سال پہلے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، قاضی صاحب نے اس پس منظر میں جواب دیا:

> صورت مسئولہ میں شوہر نفقہ کی ذمہ داریوں سے فرار کے لئے دو سال پہلے طلاق دینے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ اقرار ہے جس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق تلف نہیں کئے

جاسکتے ہیں، اس لئے شوہر کے اس بیان کی وجہ سے عورت کا نفقہ ساقط نہیں ہوگا، اگر شوہر نے طلاق دے کر عورت کو مطلع کردیا ہوتا تو وہ نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس لئے عورت اپنے کو اس کی بیوی سمجھتے ہوئے پابند رہی اور نفقہ جزاء احتباس ہے، اس لئے عورت اس مدت کا نفقہ پانے کی حق دار ہے، رہا مسئلہ طلاق کا تو دو سال پہلے طلاق دینے کا اگر کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں ہے تو طلاق وقت اقرار سے نافذ قرار پائے گی، سابق سے نہیں۔

جائز متبادل کی نشاندہی

بہت سے مواقع پر محض کسی بات کو حرام کہہ دینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ اس کے جائز متبادل کو پیش کیا جائے، قاضی صاحب اپنے زبانی اظہار رائے میں بھی اس کو ملحوظ رکھتے تھے اور آپ کے بعض فتاویٰ بھی اسی طریقہ فکر کے مظہر ہیں، مثلاً ایک گاؤں میں معلم کو زکوٰۃ دینے سے متعلق سوال کیا گیا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

> مدرسین کو درس کی اجرت میں فطرہ یا زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور اس طرح یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، ہاں اگر وہ مولوی صاحب جو مسجد میں درس دیتے ہیں، اگر وہ محتاج ہیں اور مستحق زکوٰۃ ہیں تو انہیں فطرہ یا زکوٰۃ کی رقم مستحق ہونے کی حیثیت سے دی جاسکتی ہے، اگر ایسا ہے تو مولوی صاحب کو چاہیے کہ اللہ کی رضا کے لئے پڑھائے اور اہل بستی زکوٰۃ وفطرہ کی رقم جمع کرکے ان کی مدد کریں، بشرطیکہ وہ محتاج اور مستحق ہوں۔

انجمن پنجابیان رام پور نے اسکول کے سلسلہ میں کچھ مشکلات لکھی تھیں اور فی سبیل اللہ کی مد سے زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کی اجازت چاہی تھی، آپ نے جواب میں ناجائز صورت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ جو گنجائش نکل سکتی ہے، اسے بھی واضح فرمایا، چنانچہ رقم طراز ہیں:

> زکوٰۃ کی رقم عمارت کی تعمیر و توسیع میں خرچ نہیں کی جاسکتی ہے، غریب طلبا کی فیس، کتابیں، کپڑے وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاتی ہے، اساتذہ کا

> مشاہرہ اگر بطور فیس طلبا سے وصول کیا جاتا ہے تو غریب طلبا پر جتنی بھی فیس آتی ہو وہ زکوٰۃ کی مد سے دی جاسکتی ہے، وہ بچے جو اغنیاء کی اولاد ہیں یعنی جن کے والدین غنی ہیں ان پر نہ بصورت مشاہرۂ اساتذہ اور نہ بصورت کتاب زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے، اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم بمد تعلیم دی ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مستحق بچوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

فتویٰ میں تذکیر وترہیب

فتوے میں آپ اس بات کی بھی رعایت کرتے تھے کہ کہیں ضرورت پیش آتی تو حکم شرعی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تذکیری وترہیبی جملے بھی لکھ دیتے، تاکہ مستفتی کو عمل کی تحریک پیدا ہو، اسی طرح بعض صورتیں جائز لیکن خلاف احتیاط ہوتیں، تو حکم شرعی بتاتے ہوئے احتیاطی پہلو پر بھی متوجہ فرمادیتے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

> صورت مسئولہ میں براہ راست شراب کے کام کے لئے ملازمت نہیں ہے، اس لئے آپ کی ملازمت جائز ہے اور آپ کی تنخواہ حلال ہے، البتہ ایک مسلمان کو ایسے کام سے کراہیت ہونا فطری ہے، اس لئے کوشش کرکے دوسرے کام میں منتقل ہونا چاہیے۔

اسقاط حمل کے جس فتوے کا ذکر اوپر آیا ہے، اس کے آخری فقرے اس طرح ہیں:

> ان حالات میں ہماری رائے میں اسقاط حمل سے قطعی پرہیز کرنا چاہیے، اور کسی نئی جانچ کی بھی ضرورت نہیں، کہ ہم اس کے مکلف نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سارے اندازوں کو غلط کردیں اور اگر خدا نخواستہ بچہ مریض ہی پیدا ہوتا ہے تو اس کی تیمارداری کا اجر باپ کو ملے گا، اور اگر موت ہوگئی تو یہ بچہ والدین کے لئے اجر، ذخیرۂ آخرت اور شفاعت کرنے والا ثابت ہوگا، جو دعا ہم بچہ کے جنازہ پر پڑھتے ہیں، اس کا خلاصہ یہی ہے "اے اللہ اس بچہ کو ہمارے لئے اجر بنا، ذخیرہ بنا، اس کو ہمارے لئے شفاعت کرنے

والا بنا اور اس کی سفارش کو میرے حق میں قبول فرما"۔

یاد رکھیں کہ مریض کو تکلیف سے بچانے کے لئے دوا دے کر یا دوا چھوڑ کر موت تک پہنچا دینا، (Active) اسلامی نقطۂ نظر سے قطعی جائز نہیں، یہ یورپ کی خود غرضی اور عقیدۂ آخرت سے محرومی کا نتیجہ ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدین کو آزمائش میں نہیں ڈالے اور بچہ صحیح سالم پیدا ہو، بڑے اور پھلے پھولے، آمین۔

مستفتی کے مصالح کی رعایت

اسی طرح مستفتی کے شخصی مصالح کو بھی پیش نظر رکھتے اور مزاج شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ایسی بات کی تلقین کرتے جو اس کے مفاد میں ہو، ایک فتویٰ میں اولاد کے درمیان ہبہ میں کمی بیشی کرنے کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے استفتاء کے ایک نکتہ پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں:

سوال میں یہ بھی ہے کہ "زید اپنے لئے کچھ نہیں رکھنا چاہتا ہے، زید کو ایسا کرنا اور اپنے کو بالکل تہی دست بنا لینا مناسب نہیں ہے، ورنہ زید پریشانی میں پڑ سکتا ہے، ضروری ہے کہ زید اپنی ضروریات کے لئے کچھ رکھ لے"۔

قول دیانت پر فتویٰ

افتاء کے سلسلہ میں اصل اصول یہ ہے کہ قول دیانت کو اختیار کیا جائے، لیکن بہت سے ارباب افتاء قول قضا پر فتویٰ دیا کرتے ہیں، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بھی اپنی بعض تحریروں میں اس پر گلہ کیا ہے، قاضی صاحب اپنے فتاویٰ میں اس اصول کو ملحوظ رکھتے تھے، قول دیانت کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے، ایک سوال طلاق کے الفاظ کنایہ سے متعلق تھا، قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، فقہاء کی عبارات پیش کی، پھر جواب کا خلاصہ اس طرح درج فرمایا ہے:

پس مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں سوال میں مذکور خط کے جملوں سے طلاق اسی

صورت میں واقع ہوگی، جبکہ کاتب تحریر نے طلاق کی نیت بھی کی ہو، اگر شوہر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ جملے لکھتے وقت طلاق کی نیت بھی نہیں کی تھی تو اس سے حلف لے لیا جائے، اگر وہ حلفاً طلاق کی نیت سے انکار کر دے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی بیوی حسب سابق اس کی بیوی رہے گی، والقول له بیمینه في عدم النیة (درمختار ۲/ ۴۶۵)۔

اسی طرح ایک مسئلہ لفظ طلاق کے تکرار کا آپ کے سامنے آیا، جس میں مستفتی کا کہنا ہے کہ اس کی نیت طلاق رجعی ہی کی تھی، قاضی صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

اگر آپ نے تین بار الفاظ طلاق کے دہرائے لیکن دو یا تین کا عدد نہیں بولے، تو اس صورت میں آپ کی نیت دیکھی جائے گی، اگر آپ کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی تو ایسی صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، عدت کے اندر لوٹا سکتے ہیں وار بعد عدت فریقین کی مرضی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

رفع اختلاف کی کوشش

جن مسائل میں سلف صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء رہی ہیں اور ان آراء میں کسی پہلو میں اتباع نفس کا شبہ نہیں تو قاضی صاحب اس میں توسع اور رفع اختلاف کی صورت اختیار کرتے تھے، مثلاً نماز تہجد کی جماعت کے سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

غیر رمضان میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام چاہے وہ شب برأت ہی کیوں نہ ہو درست نہیں ہے، رمضان المبارک میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہیں کریں اور وہ گھر پر یا مسجد میں اپنی نماز تنہا ادا کریں تو انہیں برا کہنا یا ملعون قرار دینا بہت بری بات ہوگی، جس مسجد میں شب برأت میں جماعت سے تہجد ہوتی ہے تو اسے بلاشبہ روک دینا چاہیے، رمضان میں گنجائش ہے، اس لئے اسے روکنا مناسب نہیں، البتہ جو شریک نہیں

ہونا چاہیے اور شریک نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

قاضی صاحب اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے کہ فتاویٰ امت کے اختلاف کو رفع کرنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا سبب بنے اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو افتراق و انتشار سے بچایا جائے، میرے قصبہ جالہ سے قریب گڑھول نامی ایک قدیم آبادی ہے، جو ایک بڑے صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا بشارت کریمؒ کی وجہ سے پورے بہار میں معروف ہے، یہاں پہلے جمعہ نہیں ہوا کرتا تھا، اب آبادی بڑھ گئی ہے، سہولتوں میں اضافہ ہوگیا، اس لئے کچھ لوگ جمعہ قائم کرنا چاہتے تھے اور کچھ اس کے خلاف تھے، قاضی صاحب کے پاس یہ مسئلہ آیا، آپ نے بحیثیت قاضی جمعہ کی اجازت دے دی، کیونکہ امیر و قاضی کی اجازت سے فقہاء احناف کے یہاں نماز جمعہ درست ہوجاتی ہے، اس طرح یہ اختلاف رفع ہوگیا۔

فتویٰ میں بھی اتحاد امت کا لحاظ

ایک جگہ عیدگاہ کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا اور باہمی گروہ بندی کی وجہ سے ایک گروپ نے الگ عیدگاہ بنانی چاہی، اس سلسلہ میں استفتاء آپ کے سامنے آیا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

> آپ لوگ ہرگز دوسری جگہ عیدگاہ نہ بنائیں، جہاں پہلے نماز ہورہی تھی، وہیں نماز ادا کریں، نفسانیت کی بنیاد پر امت میں افتراق پیدا کرنا بڑا گناہ ہے، جیسے پورب محلہ کے امام صاحب نماز پڑھاتے تھے، ویسے ہی پڑھاتے رہیں، آپ سب لوگ مل کر اسلامی اتحاد اور مسلمانوں کی شوکت کا مظاہرہ کریں۔

سوال کا دقت نظر سے مطالعہ

قاضی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ وہ سوال کو بھی بہت ہی دقت نظر کے ساتھ غور کرتے تھے، اور سوال پوری طرح سمجھ کر پھر جواب تحریر فرماتے تھے اور بعض اوقات اس کی مزید وضاحت کے لئے جواب میں پہلے خلاصہ سوال کو درج کردیتے تھے، تاکہ کوئی التباس و اشتباہ باقی نہیں رہے اور

کوئی فریق فتوے کا غلط استعمال نہ کرلے، اس سلسلہ میں آپ سے ڈیٹا بیس کمپیوٹرس نامی فرم کے پارٹنر نے جو استفتاء کیا ہے، اس کا جواب پڑھنے کے لائق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی کے ذہن میں کتنا چوکس اور اخاذ ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک استفتاء اور اس کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> آج استفتاء بحوالہ بالا میری نظر سے گذرا اور اس کا جواب بھی، استفتاء کا جواب دیتے وقت مسلکہ ڈکلیریشن (زبان انگریزی) کا مفہوم سمجھنے میں تسامح ہوا ہے، ڈکلیریشن میں مذکور لفظ (Irrecoverable) کا مفہوم لحاظ میں نہیں رکھا گیا ہے، جس کا مفہوم ناقابل استرداد ہوتا ہے، طلاق صریح کے ساتھ ایسے الفاظ کا اضافہ موجب بینونت ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی۔

احکام شرعیہ کی حکمت و مصلحت

حکم شرعی کے بجائے بعض لوگ احکام شریعت کی حکمت و مصلحت کے بارے میں سوال کرنے لگتے ہیں، قاضی صاحب ایسے سوالات کے بھی جواب دیتے تھے، لیکن مستفتی کی فکری کوتاہی کی طرف اشارہ بھی فرمادیتے تھے، مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے سوال کیا کہ سائنسی اعتبار سے خرگوش بلی کے قبیل کا جانور ہے، اسے حیض آتا ہے، اسلئے اس کا گوشت حرام ہونا چاہیے، شریعت میں اس کو کیوں حلال قرار دیا گیا؟ قاضی صاحب نے جواب میں پہلے تو اس اصول کو سمجھایا ہے کہ کسی چیز کا حلال و حرام ہونا اصل میں حکم الٰہی سے متعلق ہے، پھر نصوص نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے، اخیر میں واضح کیا ہے کہ خرگوش ہرن کی طرح ہے نہ کہ بلی کی طرح، بلی درندہ ہے، خرگوش درندہ نہیں، بلی حرام چیزیں جیسے چوہا وغیرہ کھاتی ہیں، خرگوش نہیں کھاتا، بلی مردار کھاتی ہے، خرگوش مردار خور نہیں۔

زبان و اسلوب

قاضی صاحب کے فتاویٰ کی زبان آسان عام فہم اور سہل و شستہ ہوتی ہے، ایسی کہ کم پڑھا

لکھا آدمی بھی پڑھ کر بہ آسانی سمجھ لے، کاش! قاضی صاحب کے تمام فتاویٰ محفوظ ہوتے تو یقیناً وہ ایک بڑا سرمایہ ہوتا لیکن انہوں نے ایک مفتی سے زیادہ مفتی گر کا کام کیا اور ملک بھر میں کتنے ہی فضلاء، جو اس وقت مسند افتاء کو سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے تربیت یافتہ یا ان کے خرمن فکر کے خوشہ چیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، افسوس قاضی صاحب کے تمام فتاویٰ محفوظ نہیں رہ سکے، تاہم کچھ فتاویٰ دارالافتاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف کے ریکارڈ سے، کچھ سہ ماہی ''بحث ونظر'' کی فائل سے اور کچھ ان کے محفوظ خطوط کے ذریعہ جمع کئے گئے جن کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے، عزیز گرامی مولانا امتیاز احمد قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ (رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی)۔ جنہیں حضرت قاضی صاحبؒ سے استفادہ کا بھی خوب موقع ملا اور خدمت کا بھی۔ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اولاً تو بہت محنت اور تلاش وجستجو سے ان فتاویٰ کو جمع کیا، پھر ان کو ابواب پر مرتب کرتے ہوئے مجموعہ کی شکل دی اور حسب ضرورت حوالہ جات کی تخریج کی، جہاں ضرورت تھی وہاں حواشی لکھے اور اس طرح اسلامک فقہ اکیڈمی کو یہ سعادت حاصل ہورہی ہے کہ اپنے بانی کے افادات کا یہ مجموعہ وہ لوگوں تک پہنچائے، اس موقع پر جہاں مجھے اس بات پر مسرت ہے کہ اردو زبان میں فتاویٰ کے باب میں ایک نئے اور مفید مجموعہ کا اضافہ ہورہا ہے وہاں اس بات پر خوشی وغم کا احساس بھی کہ صاحب فتاویٰ کی خواہش تھی کہ ان کے یہ فتاویٰ کتابی صورت میں مرتب ہوجائیں اور اس سلسلہ میں ابتدائی کوشش کے طور پر انہوں نے امارت شرعیہ سے اپنے کچھ فتاویٰ کی نقل منگائی بھی تھی، لیکن خدا کی طرف سے یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کی زندگی میں ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو، چنانچہ یہ سعادت ہم لوگوں کے حصہ میں آرہی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے، اور اس کے افادہ کو عام وتام فرمائے، نیز صاحب فتاویٰ کی بال بال مغفرت فرمائے، ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

☆☆☆

حضرت قاضی صاحبؒ کا فقہی منہج

خود آپ کی تحریروں کی روشنی میں

(حضرت مولانا عتیق احمد بستوی)

اعتدال ایک پسندیدہ صفت ہے، خواہ کسی فرد میں ہو، یا کسی قوم میں، یا کسی مذہب میں۔ دنیا کا سارا نظام اعتدال وتوازن پر چل رہا ہے، اعتدال وتوازن سے استواری وپائیداری ہوتی ہے اور بے اعتدالی اور عدم توازن سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور نظام عالم درہم برہم ہونے لگتا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اعتدال وتوازن کی صفت خاصی کمیاب ہے، ایسے افراد خال خال ہی ملتے ہیں جو اپنی زندگی اور اعمال وافکار میں صفتِ اعتدال سے بہرہ ور اور راہ اعتدال پر گامزن ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انبیاء کی صفات وخصوصیات میں یہ بات بھی شمار کرائی ہے کہ ان کی تمام صفات میں اعتدال ہوتا ہے، حتی کہ ان کی ذہانت میں بھی اعتدال ہوتا ہے، نہ وہ بلید اور کند ذہن ہوتے ہیں اور نہ حد سے بڑھی ہوئی ذہانت رکھتے ہیں۔

عام طور پر لوگوں میں (حتی کہ علماء میں بھی) افراط وتفریط ہوتی ہے، تساہل یا تشدد ہوتا ہے، معتدل ومتوازن لوگ کم ہی ہوتے ہیں، جس کو قسامِ ازل کی طرف سے اعتدال وتوازن کی دولت ملی اسے بہت بڑی چیز ہاتھ آئی۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ صاحب دور حاضر کے ان ربانی علماء میں سے تھے

جن کو اللہ تعالیٰ نے جامعیت کے ساتھ توازن واعتدال کی صفت سے متصف فرمایا تھا، اسلامی شریعت پر انتہائی وسیع وعمیق نظر رکھنے کے ساتھ حالات زمانہ اور سیاسی وسماجی تبدیلیوں سے وہ پوری طرح آگاہ تھے، احکام شریعت کے مدارج سے بہ خوبی واقف تھے، مزاجی طور پر بھی معتدل ومتوازن تھے۔

حضرت قاضی صاحبؒ اور فقہ اسلامی

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے اختصاص کا اصل میدان علم فقہ تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں تفقہ فی الدین کی دولت بے بہا سے مالا مال فرمایا تھا، وہ فقیہ ہی نہیں بلکہ فقیہ النفس تھے، اسلامی شریعت کے اصول ومقاصد اور اسلام کے دستوری قوانین پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، دور حاضر کے مسائل کو کتاب وسنت اور فقہ سلف کی روشنی میں حل کرنے پر انہیں بڑی قدرت تھی، ان میں تخریج واستنباط کا زبردست ملکہ تھا، موصوف دور حاضر کے چند ممتاز ترین فقہاء میں سے تھے، دور حاضر میں اسلام کے عدالتی نظام کی تطبیق وتنفیذ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

ان کے فقہی افکار ونظریات میں بھی بڑا اعتدال وتوازن پایا جاتا ہے، مثلاً اجتہاد وتقلید کے مسئلہ کو لیجیے جس کے بارے میں اچھے اچھوں کے یہاں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ایک گروہ تقلید کو شجر ممنوعہ قرار دے رہا ہے اور عالمان کم نظر ہی کو نہیں، بلکہ جاہلان بے بصر کو بھی اجتہاد کا حق دینا چاہتا ہے اور ان مسائل کے بارے میں اجتہاد اور تبدیلی احکام کا داعی ہے، جن کے بارے میں کتاب وسنت کی صریح وقطعی نصوص موجود ہیں۔ دوسرا گروہ اس کے بالکل برعکس اتنی مضبوطی سے تقلید کا دامن تھامے ہوئے ہے کہ لفظ اجتہاد ہی سے لرزاں وترساں ہے، اس کے نزدیک فقہاء متاخرین کی جزئیات وتخریجات بھی نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں، فقہاء کے جن مسائل کی بناء عرف اور حالات زمانہ پر ہے ان میں بھی وہ عرف اور حالات بدل جانے کے باوجود ادنیٰ ترمیم کے روادار نہیں ہیں۔

اجتہاد وتقلید کے ہنگامہ خیز مسئلہ میں ہمیں حضرت قاضی صاحبؒ کے یہاں نقطۂ اعتدال کی وکالت وترجمانی نظر آتی ہے اور طاقتور انداز میں راہ اعتدال کی دعوت ملتی ہے، اجتہاد وتقلید کے موضوع پر ''اسلامی عدالت'' کے مقدمہ اور ''مباحث فقہیہ'' میں قاضی صاحب کی بحث بڑی بصیرت افروز اور فکر انگیز ہے، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اجتہاد

فقہ اسلامی ایک زندہ قانون ہے، جسے قیامت تک زندہ رہنا ہے، اس لیے اجتہاد کے ذریعہ احکام کی تخریج واستنباط کے قواعد وضوابط فقہاء اسلام نے پوری طرح منضبط کردیے ہیں اور صدیوں تک اسی قانون پر جدید سے جدید تر تہذیب وثقافت کی بلند وبالا عمارت قائم رہی ہے اور ہمارا یقین ہے دنیا کے ہر سماجی وتہذیبی انقلاب کی رہنمائی کے لیے فقہ اسلامی کافی ہے۔

یہ بحث بہت عام ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا ہے، اس میں غلط فہمی دونوں طرف ہے، متجددین علماء اور فقہاء پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ انہوں نے باب اجتہاد صدیوں سے مسدود کردیا اور اس طرح اسلام عصر حاضر کا ساتھ دینے کا اہل نہیں رہا، دوسری طرف علماء میں ایک طبقہ اجتہاد کو واقعی ایسا ''شجر ممنوعہ'' سمجھتا ہے، جس کا نام زبان پر لانا گناہ اور اجتہاد کا نام لینے والا مشکوک قرار پاتا ہے۔

حقیقت دونوں سے دور ہے، علماء نے یہ نہیں کہا کہ باب اجتہاد ہمیشہ کے لیے مسدود ہوچکا اور کسی خاص تاریخ تک اجتہاد جائز تھا اور اس کے بعد اجتہاد ممنوع ٹھہرا، اصل مسئلہ اجتہاد کا نہیں، صلاحیت اور اہلیت اجتہاد کا ہے، یعنی اگر دین قیامت تک کے لئے ہے تو باب اجتہاد بھی قیامت تک کھلا رہے گا، دشواری یہ ہے کہ افراد میں اجتہاد کی مطلوبہ اہلیت وصلاحیت مفقود ہوتی جارہی ہے، پس اگر اجتہاد کا کام بند ہوا تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ علماء مفقود ہوگئے جو اجتہاد کے منصب پر اپنی اہلیت وصلاحیت کے ذریعہ فائز ہوسکتے تھے، ورنہ قاضی جس کا تقرر قیامت تک رہنا ہے، اس کے لئے اجتہاد کو شرط صحت، یا شرط اولیت قرار دینے کوئی معنی نہیں، علماء اصول کے مابین تو اس مسئلہ پر بحث رہی ہے کہ کوئی زمانہ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں جو مجتہد سے خالی ہو، اس بحث کی تلخیص ڈاکٹر طیب خضری نے اپنی کتاب "الاجتهاد فيما لا نص فيه" میں کی ہے، جس کا ذکر کردینا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

ہم نے یہ مفصل بحث اس لیے نقل کر دی کہ مسئلہ کے مختلف پہلو سامنے آجائیں، ہمارے نزدیک ان واقعات اور حالات کی روشنی میں جو پچھلے طویل زمانہ سے پیش آرہے ہیں، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ کسی زمانہ کا مجتہد سے خالی ہونا ممکن نہیں کہ واقعات وحالات اس نظریہ کا ساتھ نہیں دیتے، لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ اس قول کی بھی کوئی گنجائش نہیں، متاخرین میں کسی صاحب اجتہاد شخص کا پیدا ہونا ممکن ہے، حقیقت یہ کہ ذکاوت وفطانت اور ذہن رسا کی نعمت اللہ نے چھین نہیں لی ہے، وسائل اجتہاد اور علوم ومعارف کے خزانوں تک رسائی، عہد متاخرین میں جس طرح آسان ہوگئی ہے، پہلے کبھی نہیں تھی، سلف کی محنت آج روزانہ مدفون کتب خانوں سے نکل کر اس تیزی کے ساتھ سامنے آرہی ہے کہ جس کا پہلے تصور مشکل تھا اور ان عظیم علمی خزانوں کو دیکھ کر برجستہ کہنا پڑتا ہے "اخرجت الأرض أثقالها" (سورۂ زلزال ر ۲)، لیکن مسئلہ نہ ذکاوت وفطانت کا ہے، نہ فہم صحیح کا، نہ وسائل علم کا اور نہ خزانہ علمی تک رسائی کا، اصل مسئلہ ہماری کوتاہ ہمتی کا ہے، مشاغل علمیہ سے گریز کا ہے، علم کی راہ میں شب بیداری کے فقدان کا ہے، فکر میں عدم توازن اور بے اعتدالی کا ہے، خوفِ آخرت اور امور دین میں احتیاط کی کمی کا ہے، ورع وتقویٰ کے فقدان کا ہے اور نتیجتاً اہلیت اجتہاد کے ناپید ہونے کا ہے اور اگر اہلیت اجتہاد مفقود ہو اور پھر اجتہاد کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ حدیث رسول ﷺ کے مطابق "ضلوا وأضلوا" (صحیح البخاری، کتاب العلم) (خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا) ہی ہوسکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد کے بہت سے مراتب ہیں، ضروری نہیں کہ سبھی مجتہدین اپنی سبھی صلاحیتوں میں مساوی ہوں، کم سے کم اور ضروری حد تک اہلیت اجتہاد موجود ہو تو پھر اس کے بعد اپنی اپنی محنت، صلاحیت اور اللہ کی عنایت سے مجتہدین میں فرق مراتب پیدا ہوسکتا ہے اور کسی کا علم کسی سے زیادہ ہوسکتا ہے، کہ "فوق کل

ذي علم عليم" (سورۂ یوسف ر ۷۶)، بعض وہ مجتہدین ہیں جنہوں نے اصول استنباط وضع کیے ہیں، مناہج فکر متعین کی ہیں، بعض وہ ہیں جو اصول میں مقلد ہیں، لیکن فروع کی تخریج اور جزئیات کے استنباط میں خود اجتہاد کرتے ہیں، بعض علماء ائمہ سے منقول مختلف اقوال وروایات میں انہیں کے قائم کردہ اصولوں کی روشنی میں کسی قول کو دوسرے قول پر، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ابوحنیفہؒ، ابویوسفؒ، محمد بن حسنؒ، زفر بن ہذیلؒ، عافیہ بن یزید الاودیؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ، ابن جریر طبریؒ، ابوثورؒ، امام طحاویؒ، امام بویطیؒ اور اس درجہ کے لوگ تو ہر زمانہ میں نہیں پیدا ہوتے، لیکن خود قفالؒ، ابن دقیق العیدؒ، عز بن عبدالسلامؒ، قاضی خاںؒ، برہان الدین مرغینانیؒ اور علامہ کمال الدین ابن ہمامؒ جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کے بارے میں بہت سے علماء کی رائے ہے کہ یہ حضرات صاحب اجتہاد تھے، اس آخری دور میں شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی اہلیت اجتہاد سے کیسے انکار ہوسکتا ہے؟ اور اگر یہ ضروری نہیں کہ مجتہد اپنے مجتہد ہونے کا دعویٰ کرے تو اس آخری عہد اور ماضی قریب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اجتہادی صلاحیتوں اور ان کے مجتہدانہ فتاویٰ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، خیال رہے کہ مجتہد کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سلف کی تحقیقات کی بساط الٹ کر اپنی طرف سے کوئی نئی بات کہہ دے تو مجتہد ہے، حضرت تھانویؒ نے جس طرح اپنے عہد کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے پیش آمدہ مسائل کا حل کیا ہے، قواعد شرع پر جیسی ان کی گہری نگاہ ہے، اقوال سلف کی جس طرح وہ رعایت کرتے ہیں تاکہ خرق اجماع لازم نہ آئے، مناط حکم پر جیسی ان کی نگاہ رہتی ہے اور فتویٰ میں جس شدت احتیاط اور ورع وتقویٰ کو وہ برتتے ہیں ان کی نادرۂ روزگار شخصیت سلف کے فقیہ النفس علماء کی یاد دلاتی ہے، مجھے یہ احساس ہے کہ جو کان لفظ اجتہاد کو سننا گوارہ نہیں کرتے، انہیں میرا یہ کہنا بھی شاید پسند نہیں

آئے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد حضرت تھانویؒ نے ہندوستان میں کار اجتہاد انجام دیا ہے، اگرچہ انہوں نے ہمیشہ اپنے کو مقلد کہا اور مقلد سمجھا اور ایسے کسی بھی قول سے پرہیز کیا ہے جس کی نظیر اقوال سلف میں نہیں ملتی ہو۔

اجتہاد-ایک نازک کام

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے، کہ اگر ہر کس وناکس کو اجتہاد کی اجازت دے دی جائے تو دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، خواہشات نفس کی پیروی کی جائے گی "مصالح شرعیہ" اور "مقاصد تشریع" کو نظر انداز کردیا جائے گا اور شریعت کے نزول کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، کار اجتہاد کی نازک ذمہ داری اگر نااہل افراد، یا ایسے لوگوں کے حوالہ کردی جائے تو جو خوفِ خدا سے خالی اور خشکی وتری میں بے محابا چلنے کا مزاج رکھتے ہیں تو یقین ہے کہ یہ اصول اجتہاد سے ناواقف اور اہلیت اجتہاد سے محروم لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور اللہ کی مخلوق کو بھی گمراہ کریں گے۔ آج کے عہد کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ لوگ جو مکان کی تعمیر سے لے کر معاشی مسائل تک اور پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی تدریس تک، یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت، تربیت، تجربہ، تخصص (specialisation) کو ضروری تصور کرتے ہیں، وہ دین کے معاملہ میں ناکارہ شخص کو رائے دینے اور اجتہاد کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ آج جو لوگ "اجتہاد اجتہاد" کا نعرہ باآواز بلند لگارہے ہیں، ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جو اس دور کے منکرات وفواحش اور اللہ کے دین کی حرمتوں کو اجتہاد کے مقدس نام پر محض اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لیے حلال کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خواہشات نفس کی پیروی سے خود رسول اللہ ﷺ کو منع فرمایا ہے اور شریعت منزل من اللہ کو فیصلہ کی بنیاد بنانے کا حکم دیا ہے (مباحث فقہیہ ۸۵-۸۸-۸۹)۔

تلفیق اور تتبع رخص:

تلفیق کا مسئلہ بھی فقہ واصول فقہ کے مشکل اور پیچیدہ مباحث میں سے ہے، تلفیق کی حقیقت کیا ہے؟ تلفیق کی کون سی شکلیں جائز ہیں اور کون سی ناجائز؟ تلفیق اور تتبع رخص میں کیا رشتہ ہے؟ تتبع رخص (رخصتوں کی تلاش) کیا ہر حال میں ممنوع ہے یا کچھ خاص شرطوں کے ساتھ اس کی گنجائش یا استحسان ہے؟ اس طرح کے مختلف نازک پہلوؤں پر حضرت قاضی صاحب کی بحث بہت فکر انگیز، معقول اور متوازن ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

فقہاء کی جو تصریحات ہم نے ذکر کی ہے، ان سے واضح ہے کہ تلفیق کے مسئلہ میں علماء اصول اور حضرات فقہاء کے تین مذاہب ہیں:

اول: تلفیق مطلقاً جائز ہے۔

دوم: تلفیق مطلقاً ناجائز ہے۔

سوم: چند شرائط کے ساتھ تلفیق جائز ہے۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پہلا قول یعنی تلفیق کا مطلقاً جائز ہونا بہت خطرناک ہے، خاص کر ہمارے اس دور میں جس میں خواہش کا غلبہ ہے اور ورع وتقویٰ کی کمی ہے اور اباحت پسندی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے، اگر ہم اس مذہب کو اختیار کریں تو شریعت کو معطل کرنا لازم آئے گا اور دین مذاق بن کر رہ جائے گا اور لوگ دین وشریعت کو کھلونا بنالیں گے، اس کے برعکس دوسرے مذہب کو اختیار کرنا یعنی تلفیق کو مطلقاً ناجائز قرار دینا باوجودیکہ یہ قرآن وسنت سے ثابت بھی نہیں ہے، اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کے بالکلیہ پابند ہوکر رہ جائیں تو اس سے ایک طرف حرج اور تنگی لازم آئے گی اور دوسری طرف نئے فقہی مسائل کا مناسب حل پیش کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہوسکیں گے، فقہی آراء میں اختلاف کا پایا جانا دراصل اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت اور سہولت ہے اور ان میں سے ہر مذہب کی بنیاد کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہ پر ہے، لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ موجودہ زمانہ کے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں خواہ ان کا تعلق اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے، یا ان کے علاوہ زندگی کے کسی اور میدان سے، ہم مختلف فقہاء اور مجتہدین کی آراء سے استفادہ کریں، خصوصاً جب کہ تتبع رخص کی نیت سے نہ ہو، بلکہ امت سے واقعتاً حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لیے ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ وہ تلفیق ممنوع ہے جس کا مقصد واجبات وفرائض سے رہائی حاصل کرنا، خواہشات نفس کی پیروی اور محرمات شرع کے ارتکاب کے لئے حیلہ جوئی ہو، لیکن صحیح مقاصد کے لئے درج ذیل شرائط کے ساتھ تلفیق جائز ہے۔

اول: تقلید کے طور پر جو عمل ہو چکا ہے، اس سے رجوع لازم نہ آئے، مثلاً ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: "أنت طالقة البتة" تجھے قطعی اور یقینی طلاق ہے اور اس کی نیت اس سے تین طلاق کی ہے، پھر اس نے اس مسئلہ میں اپنی رائے کو نافذ کیا اور یہ یقین کرلیا کہ وہ عورت اس پر حرام ہو چکی ہے، پھر اس کی رائے یہ ہوئی کہ اس طلاق کو رجعی قرار دے کر اس سے رجعت کرلے اور اسے اپنی زوجیت میں باقی رکھے۔

دوم: یہ کہ اس سے اس کے لازم اجماعی (یعنی پہلے تقلید کے طور پر عمل کرنے کی وجہ سے جو صورت لازم آتی ہے) سے رجوع لازم نہ آتا ہو، مثلاً ایک شخص نے بغیر ولی کے نکاح کے صحیح ہونے میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کی اور ایک بالغہ لڑکی سے بلا ولی نکاح کرلیا تو اس میں شک نہیں کہ اگر نکاح کی صحت تسلیم کرلی جائے تو اس سے طلاق واقع کرنا بھی لازماً صحیح ہوگا، تو اگر یہ شخص اپنی منکوحہ کو جس سے بغیر ولی کے نکاح کیا ہے تین طلاق دے دے، پھر طلاق واقع نہ ہونے میں امام شافعیؒ کی تقلید کرنا چاہے (کہ امام شافعیؒ کے مسلک کی رو سے یہ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا، کیونکہ بغیر ولی کے تھا) تو ایسا اس کے لیے جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ سابق تقلید کے نتیجے میں لازم آنے والے لازم اجماعی حکم سے رجوع کرنا ہے۔

سوم: یہ کہ علماء کے نادر اور شاذ اقوال کو اختیار نہ کرے، کیونکہ علماء کے وہ نادر اور شاذ اقوال جنہیں امت نے مسترد کردیا ہے اور قبول نہیں کیا ہے، انہیں اختیار کرنا جائز نہیں ہے، امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں: جو شخص علماء کے نادر اقوال کو اختیار کرے گا وہ اسلام سے نکل جائے گا، سلیمان تیمیؒ کہتے ہیں: اگر تو ہر عالم کی رخصت اختیار کرے تو تجھ میں تمام برائیاں جمع ہو جائیں گی اور علماء کے شاذ ونادر سے مراد وہ اقوال ہیں جنہیں زلات (لغزشیں) کہا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر تلفیق اور تتبع رخص کو مطلقاً مباح قرار دیں تو یہ امت کے لئے فتنہ اور آزمائش بنیں گے، ہاں اگر قابل اعتماد فقہائے کرام دور جدید کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور امت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لئے ضروری شرائط کے ساتھ رخصت اور تلفیق کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں، تو میری رائے میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام علماء راسخین کے اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں انجام پائے، واللہ اعلم، (مباحث فقہیہ ۱۴۱/۱۴۲،۱)۔

قول راجح

اس مسئلہ میں جس قول کی طرف میرا رجحان ہے، اس میں قدرے تفصیل ہے اور وہ یہ کہ تتبع رخص عام حالات میں تشہی، لہو ولعب اور خواہشات کی پیروی کی بنیاد پر ناجائز ہے، ہاں اگر کسی خاص مسئلہ میں عذر یا مرض کی ضرورت کی بنیاد پر دہو تو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے جہاں خواہشات کی اتباع اور لہو ولعب سے روکا ہے، وہیں دوسری طرف احکام میں یسر وسہولت کے پہلو کی رعایت کی ہے اور دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اور نبی علیہ ﷺ کو سیدھے اور آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے، لہٰذا اس مسئلہ میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ضروری ہے اور میری سمجھ میں یہ آرہا ہے (واللہ اعلم) کہ

وہ تتبع رخص جو ممنوع ہے اور جس کے ممنوع ہونے پر بعض حضرات نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان ہر مسلک میں سے اس قول کو اختیار کرے جو اس کے لئے آسان ہو اور یہ کسی واقعی عذر اور ضرورت کے پیش نظر نہ ہو، بلکہ محض خواہش نفس کی پیروی میں ہو، کیونکہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو یہ شریعت کے احکام سے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور دین کھلونا اور مذاق بن کر رہ جائے گا، تتبع رخص کی اس قسم میں یہ صورت داخل ہے کہ انسان تشہی اور لہو ولعب کی غرض سے مختلف مسائل میں مختلف فقہاء کے اقوال اختیار کرے، مثلاً: ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا، لیکن اسے اندیشہ ہوا کہ اس جرم کی بنیاد پر اس پر حدِ زنا قائم کی جائے گی، اس لئے اس نے ولی اور گواہ کے بغیر اس عورت سے شادی کرلی اور اس نے بالغہ عورت کے نکاح کی صحت کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اختیار کرلیا جو بالغہ کے نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری قرار نہیں دیتے اور گواہ کے بغیر نکاح صحیح ہونے کے سلسلہ میں امام مالکؒ کا قول اختیار کرلیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تتبع رخص کی یہ صورت شریعت کے ساتھ کھیل اور مذاق ہے، جسے کوئی فقیہ تو کیا، کوئی صاحب عقل انسان بھی گوارہ نہیں کرسکتا، اور فقہاء عقل ودانش کے لحاظ سے تمام لوگوں سے فائق اور شریعت کے مقاصد سے سب سے زیادہ واقف ہیں، وہ بھلا اس کی اجازت کیوں کر دے سکتے ہیں اور جہاں تک خاص حالات میں رخص مذاہب سے استفادہ کی بات ہے، مثلاً زوج مفقود الخبر کے مسئلہ میں اور بعض دوسرے مسائل میں فقہاء حنفیہ نے امام مالکؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اسی طرح فقہاء شافعیہ نے فقہ مالکی اور فقہ حنفی کے بعض اقوال کو اختیار کیا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اگر ہم ایک مجتہد کے قول پر عمل کو ضروری قرار دیں تو عصر حاضر کے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنا ممکن نہ ہوگا، بالخصوص نئے تجارتی معاملات میں اور نہ یہ بات کسی طرح مناسب

ہوگی کہ ہر مکلف کو اس کی رخصت دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے مسائل میں اپنی خواہش کے مطابق جس قول کو چاہے اختیار کرے، یہاں تک کہ وہ ایک دن کسی مسئلہ میں امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرے، اگر اس سے اس کی غرض پوری ہوتی نظر آئے اور پھر کل بعینہٖ اسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا قول اختیار کرلے، کیونکہ دوسرے دن امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرنے سے اس کا مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے اور یہ بات مخفی نہیں کہ اتباع شریعت میں تکلیف ہوتی ہے اور مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، لہٰذا شریعت کا کوئی حکم مشقت سے بالکلیہ خالی نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر حکم شرعی میں کچھ نہ کچھ مشقت ہے، ہاں ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا، پس حرج، مشقت اور تنگی کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ضروری ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ائمہ کے اقوال میں آسان قول کو اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی ضابطہ مقرر کردیا جائے، تاکہ تباہ کن اباحت پسندی اور دین سے تنفر کرنے والی تنگی دونوں کا سد باب ہوسکے، اس سلسلہ میں درج ذیل اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

۱- "الأمر اذا ضاق اتسع" مشہور فقہی قاعدہ ہے، اس کی رو سے جب کسی مسئلہ میں تنگی پیدا ہوگی تو شریعت اس تنگی کو دور کرکے وسعت پیدا کرے گی، تو جب کسی مبتلیٰ بہ کو کسی امر میں ایسی تنگی، حرج اور دشواری پیش آئے، جسے وہ برداشت نہیں کرسکتا تو ایسی صورت میں اس کے لئے جائزہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے امام کے قول کو اختیار کرے، جس میں دفع حرج ومشقت ہو۔

۲- لیکن اس صورت میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ ان ارباب علم وذکر اور اصحاب فتویٰ سے رجوع کرے، جو دین کا گہرا علم رکھتے ہوں اور ورع وتقویٰ کی صفت سے متصف ہونے سے دین کی اساس اور بنیاد سمجھے جاتے ہوں، تاکہ وہ خواہش نفس اور شیطان کے مکر وفریب کا شکار نہ ہو، کیونکہ ایک عام انسان بسا اوقات

ضرورت اور اتباع ہوی کے درمیان فرق نہیں کرسکتا۔

۳-اس پر لازم ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب سے تجاوز نہ کرے، جو صدیوں سے مدون اور منقح صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور جن پر زمانہ قدیم سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے مذاہب جو فقہی کتابوں کے ذخیروں میں منقول ومذکور ہیں وہ عام طور پر ثقہ راویوں کی روایت سے مروی نہیں ہیں اور ثقہ علماء وفقہاء کی زبانی ہر دور میں تواتر کے ساتھ نقل نہیں ہوئے ہیں، اسی طرح وہ شرائط اور قیود بھی ہمیں معلوم نہیں ہیں، جو ان کے نزدیک معتبر رہی ہوں گی۔

۴-لیکن اگر مسئلہ عموم بلوی کی وجہ سے اجتماعی ہوگیا ہو یا ایسا معاملہ ہو جو حالات اور زمانہ کی تبدیلی، یا نئے عرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، خاص طور پر لوگوں کے معاملات مثلاً تجارت، صنعت وحرفت اور تجار، صنعت کار اور اہل پیشہ کی عادات سے متعلق ہو، خصوصاً بین الاقوامی معاملات میں تو ایسی صورت میں علماء راسخین اور اصحاب تقوی فقہائے کرام پر لازم ہے کہ وہ ان مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا حل شریعت کے مقاصد اور قواعد کلیہ کی روشنی میں نئے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ تلاش کریں اور ان کے لئے ائمہ ہدی میں سے کسی ایک کے قول سے دوسرے کے قول کی طرف درج ذیل شرطوں کے ساتھ عدول کرنا جائز ہے:

۱-دوسرا قول شاذ نہ ہو۔

۲-نص سے ٹکراتا نہ ہو (مباحث فقہیہ ۱۲۸-۱۳۰)۔

عتیق احمد بستوی

(سکریٹری برائے علمی امور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

عرض مرتب

میرے لیے بڑی خوش بختی اور توفیق خداوندی کی بات ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے فضل وعنایت سے برصغیر ہندوپاک کے مشہور فقیہ، عظیم محقق اور صاحب نظر عالم کے گرانقدر فتاوی کو ترتیب دینے اور ان میں بکھرے ہوئے علمی موتی کو یکجا لڑی میں پرونے کی توفیق بخشی، جو اس حقیر طالب علم کی علمی بساط سے بہت بلند وبالاتر چیز تھی۔

صاحب فتاوی ''فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی'' (اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھر دے) نے اپنی حیات ہی میں اس ناچیز پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے اس قیمتی علمی سرمایہ کو ترتیب دینے اور کتابی شکل میں پیش کرنے کی اجازت فرمائی تھی، ۲۰۰۰ء میں جب میں ''المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء امارت شرعیہ، پٹنہ'' سے تعلیمی سال مکمل کرکے فارغ ہوا تو مخدومی حضرت قاضی صاحبؒ نے مجھے اور میرے رفیق درس مولانا سہیل اختر قاسمی (جو اس وقت دار القضاء امارت شرعیہ میں ہیں) کو ایک مخطوطہ ''فتاوی رحمانیہ'' پر کام کرنے کا حکم فرمایا، اپنے مکان محلہ مہدولی، دربھنگہ میں ساتھ رکھ کر پورے رمضان المبارک کام کرنے کا طریقہ اور نہج بتایا۔ اسی اثناء میں نے حضرت قاضی صاحبؒ سے درخواست کی کہ میں آپ کے فتاوی کو ترتیب دینا چاہتا ہوں، ان کی خورد نوازی تھی کہ انہوں نے مجھے اس کی اجازت عنایت فرمائی، چنانچہ دار الافتاء امارت شرعیہ سے رجسٹر منگوایا گیا جو بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس میں سے

حضرت قاضی صاحبؒ کے فتاوی کا زیراکس کرایا، پھر اسے حضرت قاضی صاحبؒ کو دکھایا، آپ نے ان میں سے اہم اور نئے موضوعات پر مشتمل فتاوی کو اس میں شامل کرنے کے لیے صحیح کا نشان لگایا اور بعض کو چھوڑ دیا، اس طرح یہ کام اسی جگہ سے شروع ہوا جہاں آج آپ مدفون ہیں، پھر جب آپ دہلی تشریف لائے تو کام مزید کچھ آگے بڑھا، بحث ونظر اور اکیڈمی کے دار الافتاء سے حضرت کے فتاویٰ لیے گئے، لیکن درمیان میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے ترتیب کا کام بالکل رک گیا، حضرتؒ کی خواہش تھی کہ ان کے فتاوی ان کی زندگی میں شائع ہو جائیں، مجھے اس کا زندگی بھر قلق رہے گا کہ میں ان کی حیات میں اس کام کو مکمل نہ کر سکا، دراصل قادر مطلق کو یہی منظور تھا۔

یہ وہ فتاوی ہیں جو مجھے دستیاب ہو سکے، ورنہ ان کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے فتاوی تھے جو یا تو محفوظ نہیں رہ سکے یا تلاش بسیار کے باوجود اس وقت دستیاب نہیں ہو سکے، اس کے دو اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ شروع سے آپ کے فتاوی کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا جا سکا، دوسرے یہ کہ آپ منصب قضا پر فائز رہنے کی وجہ سے فتوی پر اپنا دستخط کرنے میں احتیاط برتتے تھے، اس سلسلہ میں میں نے حضرت قاضی صاحبؒ سے دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس وقت دار الافتاء میں کوئی متعین مفتی نہیں تھا، اس لئے بعض اوقات میں املا کرا دیا کرتا تھا، لیکن اپنا دستخط نہیں کرتا تھا، ظاہر ہے کہ اب ان فتووں کی شناخت دشوار ہے، اس کے علاوہ ''افکار ملی'' میں بھی مسلسل ایک سال تک نئے مسائل پر آپ کے فتاوی سوال وجواب کی شکل میں شائع ہوتے رہے، افسوس کہ اس کا ریکارڈ محفوظ نہیں رہا اور تلاش کے باوجود نہیں مل سکا، اس لئے وہ بھی اس مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے۔

ادھر جب چودہویں فقہی سمینار کی تاریخ کا اعلان ہوا تو جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، سکریٹری اکیڈمی مولانا امین عثمانی ندوی اور دوسرے ذمہ داران نے اس کام کو مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی، اس طرح نئے سرے سے یہ کام شروع ہوا، پہلے مرحلے میں تبویب اور فہرست سازی کی گئی، عنوانات قائم کیے گئے، سوالات کی تصحیح کی گئی اور پھر عربی مآخذ سے حوالہ جات تلاش کیے گئے، بعض لمبی عربی عبارتوں کے ترجمے حاشیہ میں کیے گئے، متن میں بعض قدیم کتابوں کے صفحات درج تھے، ان کو بدل کر نئے ایڈیشن کے صفحات، مطبع وغیرہ کے ساتھ درج کیے گئے، اس

ناچیز نے اپنی حقیر صلاحیت کے مطابق یہ کوشش کی ہے، جس کا اصل مقصود حضرت الاستاذؒ کے ایک علمی ورثہ کی حفاظت ہے، کہاں تک اس میں کامیابی ملی ہے، اس کا فیصلہ تو مستفیدین کریں گے، راقم کو اس کام میں غلطیوں اور کوتاہیوں سے انکار نہیں ہے، اگر کسی صاحب نظر کو کوئی غلطی نظر آئے تو براہ کرم اس سے مجھے مطلع فرمائیں، یہ اس حقیر مرتب کے لئے آپ کا احسان ہوگا۔

آج جبکہ ''فتاوی قاضی'' کا یہ مجموعہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے، میں بے انتہا خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ باری تعالیٰ نے مجھ ناچیز سے اپنے ایک مقبول بندہ اور خود اس حقیر کے محسن ومخدوم کی نسبت سے یہ خدمت لی۔

اس موقع پر میں تمام ذمہ داران اکیڈمی کا شکر گزار ہوں، خصوصیت کے ساتھ صدر اکیڈمی حضرت مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کا، کہ انہوں نے میری درخواست پر مبسوط ''مقدمہ'' تحریر فرمایا، نائب صدر اکیڈمی، صاحب نظر عالم دین، عربی ادب کے مشہور انشاء پرداز اور محقق حضرت مولانا بدر الحسن القاسمی کا، کہ انہوں نے ادنیٰ سی درخواست پر اپنی علمی مصروفیت کے باوجود بصیرت افروز اور چشم کشا ''پیش لفظ'' تحریر فرمایا، سکریٹری جنرل حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا کہ انہوں نے نہ صرف حضرت قاضی صاحبؒ کے فتاوی کی خصوصیات تحریر فرمائی، بلکہ پورے مسودہ کو دقت نظر سے دیکھا، حاشیہ میں کچھ حذف واضافہ کی ہدایت بھی فرمائی، سکریٹری برائے علمی امور حضرت مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کا، کہ انہوں نے بھی حضرت قاضی صاحبؒ کے فقہی منہج پر اپنی تحریر عنایت فرمائی، اس کے ساتھ ساتھ شعبۂ علمی اور شعبۂ کمپیوٹر کے ان تمام رفقاء کا جنہوں نے جگہ جگہ اس کام میں میرا تعاون فرمایا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ صاحب فتاوی کی بال بال مغفرت فرمائے، اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمائے، آمین، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّکَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيم۔

امتیاز احمد قاسمی
(رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

بروز شنبہ، ۱۵ر جون ۲۰۰۴ء

فَسْـئَلُوْا
أَهْـلَ الـذِّكْرِ
إِنْ كُـنْـتُـمْ
لَاتَـعْـلَـمُـوْنَ

(سو اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو
اہل علم سے پوچھ دیکھو)

کتاب الطہارۃ

بغیر عذر شرعی تیمّم کرنے کا حکم

کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں ماسٹر صاحب امام ہیں، وہ غسل نہیں کرتے ہیں اور وضو بھی کبھی کبھی کرتے ہیں، بلکہ اس کے بدلے عام طور پر تیمم کر لیتے ہیں، جبکہ ان کو کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح ہے؟ نیز اس کی اور دوسرے مقتدیوں کی نماز ایسی حالت میں ہو جائے گی؟

الجواب وباللہ التوفیق

اگر بغیر عذر شرعی ماسٹر صاحب تیمم کرتے ہیں تو نہ ان کی نماز صحیح ہوتی ہے اور نہ ان کی اقتداء کرنے والوں کی، اور اگر وہ کبھی بھی غسل نہیں کرتے اور وضو نہیں کرتے ہیں اور ان کے پاس کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے تو بہت بڑا گناہ اور بہت دور تک پہنچانے والا ہے (أعاذنا اللہ منہ)۔

ایسی صورت میں جبکہ بظاہر وہ معذور نہیں ہیں اور پھر بھی تیمم کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اپنے خیال میں اپنے کو معذور سمجھتے ہیں تو انہیں ان کے اپنے حق میں چھوڑ دیا جائے، لیکن انہیں امامت ہرگز نہیں کرنی چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الصلاۃ

باب العیدین

کیا تکبیر تشریق کے الفاظ حدیث سے ثابت ہیں؟

مدرسہ وصیت العلوم کے ایک مفتی صاحب سے سہارنپور میں ملاقات ہوئی تھی، ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا، انہوں نے ایک سوال کیا تھا، فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں تھا، میں نے آکر فوری طور پر چند کتابیں دیکھیں، جن سے واضح ہوا کہ تکبیر تشریق کے الفاظ نہ صرف ثابت ہیں، بلکہ دار قطنی میں مروی حضرت جابر کی مرفوع روایات میں سے ایک روایت کے الفاظ ہیں: "روی جابر أن النبي ﷺ صلى الصبح يوم عرفة وأقبل علينا فقال: "الله أكبر الله أكبر" ومدّ التكبير إلى العصر من آخر أيام التشريق"، أخرجه الدار قطني من طرق، وفي بعضها: "الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر ولله الحمد"(۱)۔

موسوعہ عمر بن الخطاب میں تکبیر تشریق کے الفاظ یہ ہیں: "الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر، الله أكبر ولله الحمد"(۲)۔

موسوعہ عبداللہ بن مسعود میں ہے: "صيغة تكبير التشريق التي كان يكبرها ابن مسعود هي: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله، الله أكبر، الله أكبر ولله الحمد"(۳)۔

المغنی میں ہے: "وصفة التكبير: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر

(۱) المغنی ۲/۲۴۶ طبع دار الفکر بیروت۔

(۲) موسوعہ عمر بن الخطاب/۲۰۷۔

(۳) موسوعہ عبداللہ بن مسعود/۱۴۸ بحوالہ ابن ابی شیبہ ۱/۸۴، المحلی ۵/۹۱، المجموع ۵/۴۵، المغنی ۲/۳۹۴۔

الله أكبر ولله الحمد، وهذا قول عمر وعلي وابن مسعود، وبه قال الثوري وأبو حنيفة وإسحاق وابن المبارك"(۱)۔

موسوعہ علی بن ابی طالب میں ہے: "صيغة التكبير التي يلتزمها في تكبير التشريق هي: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر الله أكبر ولله الحمد"(۲)۔

غرض یہ کہ آثار صحابہ اور بعض روایات مرفوعہ سے ان الفاظ کا ثبوت ملتا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) المغنی ۲/۲۴۷ طبع دار الفکر بیروت۔

(۲) موسوعہ علی بن ابی طالب/۱۵۳ بحوالہ ابن ابی شیبہ ۱/۸۴، مسند زید ۲/۳۴۳، کنز العمال ۱۲۷۵۴۔

باب القرأة

فاتحہ اور سورہ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے؟

۵/جمادی الاول ۱۳۸۳ھ کو نقیب میں اسلامی مسائل کے عنوان سے جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس میں سے ایک مسئلہ کہ فاتحہ اور سورہ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا بہتر اور مستحب ہے، عام کتب فقہ اور فقہاء احناف کے قول کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ذیل میں بعض حوالے ملاحظہ فرمائیں:

۱-عالمگیری میں ہے: "ولا يسمى بين الفاتحة والسورة هكذا في الوقاية والنقاية هو الصحيح هكذا في البدائع والجوهرة النيرة" (الفتاوی الہندیہ، باب صفۃ الصلاۃ ۱/ ۷۴)۔

۲-اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: "لا يأتي الإمام بالتسمية بين الفاتحة والسورة" (خلاصۃ الفتاوی ۱/ ۵۳)۔

۳-شرح النقایہ جلد اول میں ہے: "ولا يسمى بين الفاتحة والسورة"۔

۴-"وتُسَنُّ التسمية في أول كل ركعة قبل الفاتحة" (مراقی الفلاح علی الطحاوی ۱۴۱/)۔

۵-حنفیہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ میں ہے: "ويسمى لا بين الفاتحة والسورة" (شرح الوقایہ، باب صفۃ الصلاۃ ۱/ ۱۴۵)۔

۶-غنیۃ المستملی میں ہے: "وأما الموضع الثالث ففي رواية عن أبي حنيفة أن محلها أول الصلاة والصحيح أن محلها أول كل ركعة ...... عند أصحابنا جميعا لا خلاف فيه" (کبیری/ ۳۰۷)۔

اس بحث سے متعلق آگے صفحہ ۳۰۸ پر تحریر فرماتے ہیں: "وأما التسمية عند ابتداء السورة بعد الفاتحة فإنه عند أبي حنيفة لا يأتي بها لا في

حالة الجهر ولا في المخافتة وكذا عند أبي يوسف لما تقدم أنها ليست بآية من أول السورة والإتيان بها في أول ركعة لما تقدم من الأحاديث الدالة على أنه عليه السلام كان يأتي بها سرا وكذا الخلفاء الراشدون" (کبیری)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب مبسوط میں ہے: "وروى المعلى عن أبي يوسف عن أبي حنيفة أنه يؤتي بها في أول كل ركعة وهو قول أبي يوسف وهو أقرب إلى الاحتياط لاختلاف العلماء والآثار في كونها آية من الفاتحة، وروى ابن أبي رجاء عن محمد رحمه الله تعالى أنه قال: إذا كان يخفي القرأة لا يأتي بالتسمية بين السورة والفاتحة، لأنه أقرب إلى متابعة المصحف وإذا كان يجهر لا يأتي بها بين السورة والفاتحة، لأنه لو فعل لا خفى بها فيكون ذلک سكتة له في وسط القرأة ولم ينقل ذلک مأثورًا" (مبسوط السرخسی ۱/ ۱۶)۔

علامہ شامی کی عبارت جس سے تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ پر استدلال کیا گیا ہے، مختصر ہے، پوری عبارت اس طرح ہے، درمختار میں ہے: "لا تسن بين الفاتحة والسورة مطلقًا"۔

اس کی شرح علامہ شامی اس طرح کرتے ہیں: "(قوله لا تسن) مقتضى كلام المتن أن يقال لا يسمى لكنه عدل عنه لإيهامه الكراهة بخلاف نفي السنية، ثم إن هذا قولهما وصححه في البدائع وقال محمد تسن إن خافت لا إن جهر (بحر) وذكر في المصفي أن الفتوى على قول أبي يوسف أنه يسمى في أول كل ركعة ...... وفي رواية حسن ابن زياد أنه يسمى في الركعة الأولى لا غير، وإنما اختير قول أبي يوسف لأن لفظة الفتوى آكد وأبلغ من

لفظة المختار، ولأن قول أبي يوسف وسط وخير الأمور أوساطها، كذا في شرح عمدة المصلى" (ردالمحتار ۲/ ۱۹۲)۔

فقہاء کی ان تصریحات کے بعد بسم اللہ پڑھنے کو الحمد وسورہ کے درمیان مستحب کہنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ورجحه المحقق ابن الهمام وتلميذه الحلبي لشبهة الاختلاف في كونها آية من كل سورة۔

اس کا جواب کبیری میں دیا ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں: "واعترض الشيخ كمال الدين بن الهمام بأن مقتضي هذا أن يؤتى بها مع السورة لثبوت الخلاف في كونها من كل سورة كما في الفاتحة"۔

اعتراض نقل کرکے خود اس کا جواب بھی دیتے ہیں: "والجواب أن الخلاف أنها آية من السورة ليس في القوة كالخلاف في أنها آية من الفاتحة على ما مر فلا يؤثر في ثبوت الاحتياط كتأثيره" (کبیری/ ۳۰۷)۔

اب اخیر میں افتاء کے بعض اصول وقاعدہ کے پیش نظر امام محمدؒ اور شیخین کے اس اختلافی مسئلہ کو دیکھیں اور فیصلہ کریں۔

قال في الفتاوى السراجية: "ثم الفتوى على الإطلاق على قول أبي حنيفة ثم قول أبي يوسف ثم قول محمد ثم قول زفر والحسن ابن زياد" (شرح عقود رسم المفتی/ ۱۹)۔

اور صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں: "ولذا قال الإمام قاضي خان وإن كانت المسألة مختلفا فيها بين أصحابنا فإن كان مع أبي حنيفة أحد صاحبيه يأخذ بقولهما أي بقول الإمام ومن وافقه" (شرح عقود رسم المفتی/ ۲۰)۔

عقود رسم المفتی میں اس کی تصریح موجود ہے کہ صحيح، أصح، الأظهر، الأوجه، المختار، آكد، المؤكد، به يفتى اور عليه الفتوىٰ میں به

يفتى اور عليه الفتوى سب سے زیادہ صحیح قول ہے، جیسا کہ ابھی علامہ شامی کی عبارت گذر چکی کہ لفظ "فتویٰ" آکد وابلغ ہے لفظ مختار سے۔ پوری عبارت عقود رسم المفتی کی اس طرح ہے:

"وحيثما وجدت قولين وقد صحح واحد فذاک المعتمد بخوذ الفتوى عليه الأشبه والأظهر المختار وذا الأوجه أو الصحيح والأصح آكد منه وقيل عكسه المؤكد كذا به يفتى عليه الفتوى وذان من جميع تلك أقوى" (شرح عقود رسم المفتی/ ۳۱، ۳۲)۔

ان تمام مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں مجھے اس مسئلہ سے اختلاف ہے کہ بسم اللہ بین الفاتحہ والسورہ مستحب اور بہتر ہے، اس لئے ان عبارتوں اور فقہاء کی تصریحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی رائے عالیہ اور فیصلہ سے مستفیض فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق

زیر بحث مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ عالمگیری نے "لا يسمى الخ"، اسی طرح خلاصہ نے "لا يأتي الإمام بالتسمية الخ"، وقایہ اور نقایہ نے "لا يسمى بين الفاتحة والسورة الخ" اور کبیری نے "عند أبي حنيفة لا يأتي بها" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ درمختار اور شامی کے الفاظ پر اگر آپ غور کریں تو یہ محسوس کریں گے کہ ان تمام الفاظ مذکورہ کا اصل مفاد یہ ہے کہ شیخین کے مسلک پر تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ مسنون نہیں ہے، پس ان تمام الفاظ کا مفاد نفی سنیت ہے، اثبات کراہت نہیں۔ اور چونکہ الفاظ مذکورہ سابقہ میں ایہام کراہت کا تھا، اسی لئے درمختار نے اس طرز تعبیر سے عدول کرکے "لا "تسن بين الفاتحة والسورة" کے الفاظ استعمال کئے، اور شامی نے اس بات کو ان الفاظ میں واضح کردیا: "مقتضى كلام المتن أن يقال لا يسمى لكنه عدل عنه لإيهامه الكراهة بخلاف نفي السنية" (۱)۔

---

(۱) ردالمحتار ۲/ ۱۹۲ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

تفصیل مذکورہ بالا کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اصل اختلاف شیخینؒ اور امام محمدؒ کے درمیان تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے بارے میں سنیت اور نفی سنیت کا ہے۔ پس شیخین اس مقام پر یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھنا سنت نہیں اور حضرت امام محمدؒ سری نماز میں سنیت کے قائل ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جس قدر بھی دلائل شیخین کی طرف سے قائم کئے گئے ہیں، اس کا مقصد نفی سنیت کا اثبات ہے نہ کہ اثبات کراہت۔ پس جب یہ بات واضح ہوگئی کہ امام صاحبؒ کا مسلک زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ سنت نہیں ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تسمیہ مکروہ بھی ہو، یا حسن نہ ہو، بلکہ عدم کراہت متفق علیہ ہے، بحر میں پڑھئے: "والخلاف في الاستنان أما عدم الكراهة فمتفق عليه"(۱)۔

رہی یہ بحث کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ حسن ہے یا نہیں؟ تو ذخیرہ اور مجتبی کی اس تصریح پر نگاہ رکھئے کہ ان کے خیال میں نماز سری ہو یا جہری امام صاحبؒ کے نزدیک تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ حسن ہوگا۔ "ولذا صرّح في الذخيرة والمجتبى بأنه ان سمي بين الفاتحة والسورة كان حسنًا عند أبي حنيفة سواء كانت تلك السورة مقروءة سرًّا أو جهرًا"(۲)۔

تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے حسن ہونے کو محقق ابن ہمامؒ اور ان کے شاگرد حلبیؒ نے راجح قرار دیا ہے، خیال رکھئے سنت ہونے کو نہیں، حسن ہونے کو اور اس پر یوں استدلال کیا ہے کہ تسمیہ ہر سورہ کا جزء ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ اس میں راجح قول ہمارے نزدیک عدم جزئیت کا ہے، لیکن اختلاف علماء کی وجہ سے جزئیت کا شبہ ضرور پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے تسمیہ کا پڑھ لینا حسن ہوگا، اگرچہ تسمیہ کے جزء فاتحہ ہونے کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ اختلاف جزئیت سورہ سے زیادہ قوی ہے اور اسی لئے یہ شبہ جو جزئیت سورہ میں پیدا ہوا ہے اس شبہ سے کمزور ہے، جو جزئیت فاتحہ میں ہے اور اس اختلاف کے قوی ہونے کی وجہ سے اور نقل روایات سے مؤید ہونے کی

(۱) البحر الرائق ۱/ ۳۳۰ طبع دار المعرفہ بیروت۔
(۲) البحر الرائق ۱/ ۳۳۰ طبع دار المعرفہ بیروت۔

وجہ سے وہاں سنیت کا قول اختیار کیا گیا اور بعض مشائخ وجوب عملی کے قائل ہوئے اور یہاں بین الفاتحہ والسورہ صرف قول حسن پر اکتفا کیا گیا۔

ورجّحه المحقق ابن الهمام وتلميذه الحلبي لشبهة الاختلاف في كونها آية من كل سورة وإن كانت الشبهة في ذلك دون الشبهة الناشئة من الاختلاف في كونها آية من الفاتحة"(۱)۔

کبیری کی پوری عبارت میرے سامنے نہیں ہے، لیکن جو عبارت آپ نے نقل کی ہے وہ یوں ہے: "والجواب أن الخلاف في أنها آية من السورة ليس في القوة كالخلاف في أنها آية من الفاتحة على ما مر فلا يؤثر في ثبوت الاحتياط كتأثيره"(۲)۔

آپ خود غور کرلیں اس عبارت کا زیادہ سے زیادہ یہ مفاد ہوسکتا ہے کہ جزئیت سورہ میں جو شبہ ہے وہ جزئیت فاتحہ کے شبہ سے کمزور ہے، اور نتیجتاً ثانی الذکر میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ حکم میں اس قوت وضعف کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، پس محقق ابن ہمام کے جواب میں کبیری نے جو کچھ لکھا ہے وہ خود محقق کی کہی ہوئی بات دہرائی گئی ہے۔ "وإن كانت الشبهة في ذلك دون الشبهة الناشئة من الاختلاف في كونها آية من الفاتحة"(۳)۔

اور ملا علی قاری نے شرح نقایہ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "أقول والأظهر أن يقرأها سرًّا ولو في الجهرية لأنها للفصل بين السورتين ولا مانع من السكتة في وسط القرأة كما سيأتي في قوله آمين سرًّا"(۴)۔

عبارت مذکورہ کے آخری جملوں سے مبسوط السرخسی کی سکتہ والی علت کا جواب بھی

(۱) البحر الرائق ۱/ ۳۱۲ طبع کوئٹہ پاکستان۔
(۲) کبیری ۱/ ۳۰۷ طبع سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان۔
(۳) البحر الرائق ۱/ ۳۱۲ طبع کوئٹہ پاکستان۔
(۴) شرح النقایہ ۱/ ۱۲۹۔

ہوگیا، غالباً یہی وہ دلائل ہیں جن کے پیش نظر مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عبارت درمختار: "لا تسن بين الفاتحة الخ" کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء سورت میں بسم اللہ پڑھنا نہ مسنون ہے اور نہ مکروہ ہے اور محققین نے اس کو راجح فرمایا ہے کہ پڑھنا بہتر اور مستحب ہے، شامی میں ہے: "ولذا صرّح في الذخيرة الخ"(١)۔

اور حضرت تھانویؒ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: "حاصل مسئلہ اولیٰ کا یہ ہے کہ گو بسم اللہ ہر سورہ کا جز نہ ہو مگر باوجود عدم جزئیت روایۃً اس کا پڑھنا ہر سورہ پر منقول ہے، پس اگر کوئی شخص ہر سورہ پر نہ پڑھے تو اس کی قرأت اس روایت کے موافق نہ ہوئی، گو کوئی جز متروک نہ ہوا ہو، جب کہ کم از کم ایک سورہ پر پڑھ لے۔ اور دوسرے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ گو روایۃً ہر سورت پر بسم اللہ منقول ہو، لیکن ہر سورہ کا جز نہیں ہے، بلکہ جز مطلق قرآن کا ہے، اگر ایک جگہ بھی پڑھ لے تو قرآن پورا ختم ہوجائے گا، گو اس روایت کے موافق اس کی قرأت نہ ہو۔ پس امام عاصمؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے قول میں کوئی تخالف نہیں، کیونکہ دونوں کی نفی اور اثبات کی حیثیتیں جدا جدا ہیں، اور حیثیات کے بدلنے سے تعارض جاتا رہتا ہے، یہ جب ہے کہ ہر سورت پر بسم اللہ نہ پڑھے اور اگر پڑھ لے تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں، اور امام صاحبؒ کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ امام صاحب تسمیہ کو ہر سورت پر ضروری نہیں کہتے، یہ نہیں کہ جائز نہیں کہتے، درمختار یا ردالمحتار میں ہر سورہ پر تسمیہ کو حسن کہا ہے" (٢)۔

اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ صورت مسئلہ آپ کے سامنے واضح ہوچکی ہوگی اور یہ بات بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے حسن ہونے کا قول جو اختیار کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس میں امام صاحبؒ کے قول کو مرجوح قرار دے کر امام محمدؒ کے قول کو اختیار کرلیا گیا

(١) فتاویٰ دارالعلوم قدیم ١/١٠٠۔
(٢) امداد الفتاویٰ ١/٣٤٦، ٣٤٧ طبع جدید دیوبند۔

ہو، تا کہ اصول افتاء کی اس بحث میں الجھنا پڑے جو رسم المفتی سے آپ نے نقل کی ہے، اور اسی طرح علیه الفتویٰ وهو المختار، آکد اور غیر آکد ہونے کی بحث بھی یہاں نہیں پیدا ہوتی، جس کے لئے آپ نے عقود رسم المفتی کی عبارت نقل کی ہے، پھر اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے پیش کردہ سارے دلائل نفی سنیت کو مفید ہیں، نفی حسن کو نہیں، لہذا آپ کا یہ کہنا کہ "مجھے اس مسئلہ سے اختلاف ہے کہ بسم اللہ بین الفاتحہ والسورہ مستحب اور بہتر ہے" قابل غور ہے فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جماعت کی نماز ہوجانے کے بعد آنے والا سری قرأت کرے گا یا جہری؟

فرض باجماعت ختم ہوجانے کے بعد آنے والا شخص اس نماز کو کس طرح ادا کرے گا جہر کے ساتھ یا سر کے ساتھ؟

الجواب وبالله التوفيق

اگر نماز جہری ہو یعنی مغرب، عشاء اور فجر تو آہستہ سے پڑھنا اور آواز کے ساتھ پڑھنا دونوں جائز ہے، لیکن آواز کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، مگر اتنی بلند آواز سے نہ پڑھے کہ دوسروں کی نماز میں خلل ہو(١)۔

(١) "وإن كان منفرداً فهو مخير إن شاء جهر وأسمع نفسه لأنه إمام في حق نفسه وإن شاء خافت لأنه ليس خلفه من يسمعه والأفضل هو الجهر ليكون الأداء على هيئة الجماعة" (الہدایہ فصل فی القراءۃ ١/٣٤٧، ٣٤٨ طبع پاکستان)۔

باب النوافل

تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کا حکم

(۱) تہجد کی نماز سنت ہے یا نفل؟

(۲) تہجد کی نماز باجماعت شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

(۳) صرف شب برأت یا شب قدر ہی میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا کیسا ہے؟

(۴) تمام لوگوں کو دعوت دے کر بلا کر باضابطہ اعلان کر کے مسجد میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز رسول اکرم ﷺ اور صحابہ وتابعین سے ایسا طریقہ ثابت ہے یا نہیں؟

(۵) جس مسجد میں پہلے سے شب برأت، شب قدر میں تہجد کی نماز جماعت سے ہوتی آرہی ہو، اب اگر امام اور پنجگانہ نمازی کے اکثر افراد جماعت سے پڑھنا صحیح نہ سمجھتے ہوں تو وہاں اس طریقہ کو بند کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۶) اگر کچھ عوام یا کچھ مقتدی یا کچھ ذمہ داران مسجد امام کو اس بات پر مجبور کردیں کہ تہجد کی نماز باجماعت پڑھانا ہوگا، تو ایسی شکل میں امام کو کیا کرنا چاہئے؟

(۷) تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے اور نہ پڑھنے دوشکلوں میں اندیشہ اختلاف وفتنہ ہو تو کیا کیا جائے؟

(۸) تہجد کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کو برا بھلا کہنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

تہجد کی پابندی حضور اقدس ﷺ نے فرمائی، تہجد کی نماز عام مسلمانوں کے لئے مسنون ہے(۱)، نفل کا لفظی معنی ''زائد'' ہے، کبھی فرض سے زیادہ کو نفل کہتے ہیں، اس طرح تمام ہی سنن کو نفل

(۱) "ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک" (سورۂ اسراء/۷۹) عن ابن عباسؓ قال: کان النبی ﷺ إذا قام من اللیل یتہجد......" (صحیح البخاری مع فتح الباری ۳/۳)، وقد اجمعوا إلا شذوذاً من القدماء علی

کہا جاتا ہے۔ کبھی نفل کا لفظ سنن غیر مؤکدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جنہیں سنن زوائد یا مندوبات بھی کہتے ہیں(۱)۔ تہجد کی نماز ہو یا کوئی اور نماز جو فرض نہیں ہے، اس کے لئے جماعت کا اہتمام اور تداعی (بلا کر اور اعلان کر کے سنن ونوافل کو باجماعت ادا کرنا) مکروہ ہے، چاہے وہ شب برأت ہو یا کوئی اور رات، اس لئے بلاشبہ پورے سال میں کوئی بھی رات ہو تہجد کی نماز ہو یا کوئی اور نفلی نماز اس کے لئے تداعی اور جماعت کا اہتمام درست نہیں ہوگا، ویسے کوئی اپنی نماز تہجد پڑھ رہا ہو اور اس کے پیچھے ایک دو آدمی شریک ہوجائیں تو کوئی حرج نہیں ہے(۲)۔

۱- رہا مسئلہ رمضان کا تو اس بارے میں فقہاء کی تصریح یہ ملتی ہے کہ رمضان میں وتر اور نوافل وتطوعات باجماعت اہتمام کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے، اب بعض علماء کی رائے عام اصول کے پیش نظر یہ ہے کہ یہاں نوافل وتطوع سے مراد صرف تراویح ہے، دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس میں تہجد بھی شامل ہے، اس لئے بعض اکابر علماء کا معمول رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کرنے کا رہا ہے، علماء کا اختلاف رحمت ہے، اس لئے ہمارے لئے دونوں راہیں کھلی ہیں، چاہے رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کریں یا تنہا تنہا(۳)۔

= أن صلاۃ اللیل لیست مفروضۃ علی الأمۃ...... وروی الطبری عن ابن عباس "أن النافلۃ للنبی ﷺ خاصۃ، لأنہ أمر بقیام اللیل وکتب علیہ دون أمتہ" (فتح الباری ۳/۳ طبع دارالمعرفۃ بیروت)۔

(۱) "النفل والنافلۃ: ما کان زیادۃ علی الأصل" (لسان العرب ۱۲/۲۴۵ طبع بیروت)، اور شامی میں ہے: "فی الشریعۃ: زیادۃ عبادۃ شرعت لنا لا علینا" (ردالمحتار ۲/۴۳۸)، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار باب سنن الوضو، باب المکروہات ۲/ ۴۲۴، ۴۳۸۔

(۲) "(ولا یصلی الوتر و) لا (التطوع بجماعۃ خارج رمضان) أي یکرہ ذلک لو علی سبیل التداعي بأن یقتدي أربعۃ بواحد" (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ۱/۴۷۶ طبع احیاء التراث العربی بیروت)۔

(۳) درمختار اور ردالمحتار کی صراحت سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نوافل رمضان یا قیام رمضان کی جماعت سے مراد تراویح کی جماعت ہے، تہجد کی نہیں، چنانچہ انہی عبارتوں کی روشنی میں مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ نے یہی فتوی دیا ہے کہ رمضان میں بھی تہجد کی جماعت تداعی کے ساتھ مکروہ ہے، لیکن شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ رمضان المبارک میں تہجد باجماعت پڑھا کرتے تھے اور دلیل میں فتح الباری وغیرہ کی عبارت جہاں نقل فرماتے تھے وہاں ردالمحتار

خلاصہ یہ ہے:

۱- غیر رمضان میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام چاہے وہ شب برأت ہی کیوں نہ ہو، درست نہیں ہے۔

۲- رمضان المبارک میں تہجد کی نماز میں جماعت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہ کریں اور وہ گھر پر یا مسجد میں اپنی نماز تنہا ادا کریں تو انہیں بُرا کہنا یا مطعون قرار دینا بہت بُری بات ہے۔

۳- جس مسجد میں شب برأت میں جماعت تہجد ہوتی ہے تو اسے بلاشبہ روک دینا چاہئے۔ رمضان میں گنجائش ہے، اس لئے اسے روکنا مناسب نہیں، البتہ جو شریک نہیں ہونا چاہے اور شریک نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

۴- میرے نزدیک رمضان ہو یا غیر رمضان، امام کو تہجد کی امامت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ رمضان کی حد تک میری رائے میں امام تہجد کی امامت کریں تو کوئی حرج نہیں۔

۵- لوگوں کو صحیح احکام ومسائل بتانا چاہئے اور یہ سمجھانا چاہئے کہ محض اپنی ضد، خواہش نفس اور رواج کو سند نہ سمجھیں، اس لئے کہ فتنہ پیدا کرنا غلط بات ہے۔

۶- جو لوگ رمضان میں تہجد کی نماز با جماعت ادا نہیں کرتے انہیں بُرا نہیں کہا جاسکتا، اکثر علمائے احناف کی رائے یہی ہے، اس لئے ان کا عمل اپنی جگہ صحیح ہے اور جو لوگ جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں انہیں بھی بُرا نہ کہا جائے کہ ان کا بھی عمل علماء کی رائے پر ہے۔

۷- واضح رہے کہ تہجد جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا مطلب جشن کرنا، رات جگا کرنا، دیگ چڑھانا نہیں ہے، قرآن پڑھا جارہا ہے، لوگ چائے نوشی میں مشغول ہیں، رکوع کے وقت دوڑے جارہے ہیں، یہ بری باتیں ہیں، ان کو سختی سے منع کرنا چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

= کی یہ عبارت بھی نقل کرتے تھے: "التنفل بالجماعة غير مستحب لأنه لم تفعله في غير رمضان" (رد المحتار ۱/۶۷۴) اور فرمایا کرتے تھے کہ تہجد بھی نوافل رمضان میں داخل ہے (فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۲۳)۔

باب صلاۃ المسافر

کیا وطن اصلی متعدد ہوسکتا ہے؟

برادر گرامی قدر جناب پی نذیر احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے دوران گفتگو مجھ سے ایک سوال کیا تھا، جس کا حاصل یہ تھا:

آپ اور آپ جیسے بہت سے لوگ، جن کا اصل وطن نارتھ آرکاٹ یا صوبہ تامل ناڈو کے مختلف قصبات میں ہے، لیکن وہ اپنی تجارت کے سلسلہ میں مدراس میں آکر قیام پذیر ہوچکے ہیں، یہاں تجارت، رہائش، اہل وعیال سب کچھ ہیں، مگر باوجود اس کے اپنے اصل وطن سے تعلق نہیں ٹوٹا ہے، وہاں بھی رہائشی مکانات ہیں، اراضی ہیں اور کچھ لوگوں کے کاروبار بھی ہیں۔ عام طور پر ہفتہ میں چند دن مدراس میں رہنے اور چند دن اپنے آبائی وطن میں گذارنے کی عادت ہے، اس طرح پابندی کے ساتھ دونوں جگہ رہنا سہنا ہے، اہل وعیال بھی کبھی یہاں اور کبھی وہاں رہتے ہیں، دونوں جگہ مستقل رہائش کا نظم ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے قصبات کو وطن سمجھ کر "مدراس" میں قصر کرنا چاہئے یا "مدراس" کو اپنا وطن سمجھنا چاہئے اور آبائی قصبات میں قصر کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق

آپ حضرات جو مذکورہ بالا صورت حال میں مبتلا ہیں، دراصل دونوں ہی مقامات پر مقیم ہیں، مدراس شہر ہو یا آپ کا آبائی قصبہ، دونوں ہی آپ کے لئے وطن اصلی کا درجہ رکھتے ہیں اور آپ لوگوں کو دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھنی چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ "وطن اصلی" (یعنی آبائی وطن یا جہاں کسی شخص نے اہل وعیال بنالئے ہوں یا وہ مقام جہاں کسی شخص نے مستقل توطن اختیار کرلیا ہو) وطن برقرار رہتا ہے اور کہیں بھی آنے جانے

سے اس کی وطنیت باطل نہیں ہوتی، تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی، اگر وہاں آئے گا تو اسے پوری نماز پڑھنی ہوگی، وطن اصلی کی یہ نوعیت اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک وہ اس وطن اصلی سے پوری طرح ترک تعلق کر کے دوسری جگہ اپنا وطن نہ بنالے۔

مشہور بات یہی ہے کہ وطن اصلی دوسرے وطن اصلی سے باطل ہوجاتا ہے، لیکن فقہاء نے اس میں ایک قید بھی لگائی ہے، وہ یہ کہ دوسری جگہ جا کر آباد ہوجانے کے بعد پہلے وطن سے اہل وعیال کو بھی نئے وطن میں منتقل کرلیا ہو، بلکہ ایک قول کے مطابق سامان وجائداد بھی منتقل کرچکا ہو، گویا کلیۃً ترک تعلق کرلیا ہو تو پہلے وطن کی وطنیت باطل ہوجائے گی، چنانچہ صاحب درمختار نے لکھا ہے: ''(الوطن الأصلي) هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه (يبطل بمثله) إذا لم يبق له بالأول أهل، فلو بقي لم يبطل بل يتم فيهما''(۱)۔

یعنی وطن اصلی کی وطنیت اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک دوسرے شہر کو وطن بنالینے کے بعد پہلے وطن میں اہل وعیال رکھنا بھی نہ چھوڑ دے، اگر ایسا نہ ہو، بلکہ دوسرے شہر میں اس نے توطن اختیار تو کرلیا ہے، لیکن پہلے وطن سے بھی تعلق باقی ہے کہ وہاں اس کے اہل وعیال رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں دونوں ہی مقامات اس کے حق میں وطن اصلی شمار ہوں گے اور اسے دونوں ہی جگہ نماز پوری پڑھنی ہوگی۔

اور عالمگیری میں ہے: ''وطن اصلی وطن اصلی سے باطل ہوجاتا ہے، جب کہ پہلے وطن سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ منتقل ہوگیا ہو اور اس صورت میں جب کہ پہلے وطن سے اہل وعیال کو منتقل نہیں کیا، لیکن دوسرے شہر میں بھی اہل بنالئے تو اس کا پہلا وطن باطل نہیں ہوگا اور دونوں ہی مقامات پر وہ نماز پوری پڑھے گا''(۲)۔

---

(۱) الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲/ ۶۱۴ طبع بیروت۔

(۲) ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي إذا انتقل عن الأول بأهله وأما إذا لم تنتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الأول ويتم فيهما (الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۱۴۲)۔

اور قاضی خاں نے لکھا ہے: "وإن تأهّل بهما كان كل من الموضع وطنًا أصليًا له"(۱)۔

یعنی اگر دونوں ہی جگہ اہل وعیال ہوں تو دونوں ہی جگہ اس کے لئے وطن اصلی ہوگی۔

اور علامہ کمال الدین ابن ہمام نے لکھا ہے: "(قوله فانتقل عنه واستوطن غيره) قيد بالأمرين، فإنه إذا لم ينتقل عنه بل استوطن آخر بأن اتخذ أهلا له في الآخر فإنه يتم في الأول كما يتم في الثاني"(۲)۔

یعنی وطن اصلی کے باطل قرار پانے کے لئے دو ضروری شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ دوسری جگہ وطن بنالیا ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ پہلے وطن سے اہل وعیال کے ساتھ منتقل ہوکر بے تعلق ہوجائے، اگر ایسا نہ ہو، مثلاً دوسری جگہ وطن بنالیا، شادی کرلیا اور رہنے لگا، لیکن پہلی جگہ بھی اہل وعیال رہے تو وہ دونوں ہی مقامات پر پوری نماز پڑھے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وطن اول میں اہل وعیال تو نہیں رکھتا، لیکن وہاں اپنا رہائشی مکان اور زمین وجائداد رکھتا ہے، تو ایسی صورت میں پہلا وطن، وطن باقی رہا؟ اس بارے میں فقہاء کی دو رائیں ہیں، ایک رائے تو یہ ہے کہ جب اہل وعیال نہیں رہتے تو وہ وطن باقی نہیں رہا، لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی اس کی وطنیت باقی رہے گی اور اسے نماز پوری پڑھنی ہوگی اور یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے جس کی طرف امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں اشارہ فرمایا ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ''اگر کوئی شخص اپنے اہل وعیال اور سامان لے کر دوسرے شہر چلا گیا، لیکن اس کا گھر اور اس کی اراضی پہلے شہر میں باقی رہے۔ تو ایک قول یہ ہے کہ پہلا شہر اس کا وطن باقی رہا، اسی طرف امام محمدؒ نے ''الکتاب'' میں اشارہ کیا ہے''(۳)۔

---

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی الہندیہ ۱/ ۱۶۶۔

(۲) فتح القدیر ۲/ ۴۰، ۴۱ طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

(۳) ''لو انتقل بأهله ومتاعه إلى بلد وبقي له دور وعقار في الأول قيل بقي الأول وطنا له وإليه أشار محمد رحمه الله تعالى في "الكتاب"'' (الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۱۴۲)، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲/ ۱۴۷ طبع بیروت۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: ”ایسی صورت میں جب کہ وطن اول میں اس کے اہل وعیال نہیں رہتے تو محض رہائشی مکانات اور اراضی کی وجہ سے وطن اصلی باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اعتبار اہل وعیال کا ہے، گھر کا نہیں، جیسے کوئی شخص کسی شہر میں شادی بیاہ کر کے مستقل رہنے لگے تو اگرچہ اس کا اپنا ذاتی مکان وہاں نہ ہو، وہ مقیم شمار ہوگا۔ ایک رائے تو یہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب تک کہ اس کا رہائشی مکان اور اراضی موجود ہیں وہ اس کا وطن برقرار رہے گا(۱)۔

علامہ شامی نے محیط وغیرہ کے حوالہ سے دونوں ہی رائیں ذکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ دوسرے قول کی بنیاد پر دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھی جائے گی اگرچہ اس میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو: ”(بل يتم فيهما) أي بمجرد الدخول وإن لم ينو إقامة“(۲)۔

اور صاحب کفایہ نے مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وفي المحيط "ولو انتقل بأهله ومتاعه إلى بلد وبقى له دور وعقار في الأول، قيل بقي الأول وطنا له وإليه أشار محمدؒ في الكتاب حيث قال: "باع داره ونقل عياله" وقيل لم يبق، وفي الأجناس ،قال هشام: سألت محمدا عن كوفى أوطن بغداد وله بالكوفة دار واختاره إلى مكة القصر؟ قال محمد: هذا حالي وأنا أرى القصر، إن نوى ترك وطنه إلا أن أبا يوسفؒ كان يتم بها، لكنه يحمل على أنه لم ينو ترك وطنه(۳)۔

یعنی اگر کوئی اہل وعیال کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہوجائے، لیکن وطن اول میں رہائشی

(۱) ”فإن ماتت زوجة في إحداهما وبقى له فيها دور وعقار قيل لا يبقى وطنا له، إذ المعتبر الأهل دون الدار، كما لو تأهل ببلدة واستقرت سكنًا له وليس له فيها دار، وقيل تبقى اهـ ..... قوله (إذا لم تبق له بالأول أهل) أي وإن بقي له فيه عقار، قال في النهر: ونقل أهله ومتاعه وله دور في البلد لا تبقى وطنًا له، وقيل تبقى، كذا في المحيط وغيره، قوله (بل يتم فيهما) أي بمجرد الدخول وإن لم ينو إقامة“ (ردالمحتار ۲/ ۶۱۴ طبع بیروت)۔

(۲) ردالمحتار ۲/ ۶۱۴ طبع دارالکتب العلمیہ بیروت۔

(۳) الکفایہ مع فتح القدیر ۲/ ۱۸ طبع رشیدیہ پاکستان۔

مکان اور اراضی موجود ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ وہ اس کا وطن باقی رہے گا، امام محمدؒ نے ”اہل وعیال کی منتقلی کے ساتھ رہائشی مکان کی فروختگی“ کا ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ محض رہائشی مکان اور اراضی کی وجہ سے وطن اول، وطن باقی نہیں رہے گا، اس سلسلہ میں ”اجناس“ میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ہشام نے امام محمدؒ سے مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص جس کا وطن اصلی کوفہ میں تھا، اب وہ بغداد میں رہنے لگا، لیکن اس کا پہلا مکان کوفہ میں موجود ہے، اب وہ حج کے ارادہ سے سفر کرے، راستہ میں کوفہ سے گذرے تو قصر کرے یا نماز پوری پڑھے؟ امام محمدؒ نے فرمایا کہ یہی تو میرا حال ہے، اگر وہ شخص ترک وطن کی نیت کر چکا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس صورت میں قصر کرنا چاہئے، لیکن امام ابو یوسفؒ کوفہ میں نماز پوری پڑھتے تھے، لیکن ان کے اس عمل کو اس بات پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کوفہ سے ترک وطن کی نیت نہیں کی ہوگی (۱)۔

آخر میں صاحب کفایہ نے نجم الدین الزاہدی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

شیخ نجم الدین زاہدی فرماتے ہیں: ”بہت سے مسلمان جو شہروں میں توطن اختیار کئے ہوئے ہیں، ان کے مکانات اور ان کی اراضی ان شہروں سے دور دیہاتوں میں واقع ہیں، جہاں جا کر وہ گرمی کا موسم اپنے اہل وعیال اور اپنے سامان کے ساتھ گذارتے ہیں، پس ان مکانات کی حفاظت بھی ضروری ہے، بیشک یہ دونوں ہی مقامات ایسے اشخاص کے لئے وطن ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے کی وجہ سے باطل نہیں ہوگا“ (۲)۔

(۱) الکفایہ مع فتح القدیر ۲/ ۱۸ طبع رشیدیہ پاکستان۔

(۲) قال الشيخ نجم الدين الزاهدي: وهذا جواب واقعة ابتلينا به وكثير من المسلمين المتوطنين في البلاد لهم دور وعقار في القرى البعيدة منها فيصيفون بها بأهلهم ومتاعهم فلابد من حفظها، أنهما وطنان له لا يبطل أحدهما بالآخر (الکفایہ مع فتح القدیر ۲/ ۱۸ طبع رشیدیہ پاکستان)۔

واضح رہے کہ امام ابویوسفؒ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر سفر واقامت میں شبہ پیدا ہوجائے تو اتمام ہی کرنا ہوگا کہ عبادات میں احتیاط ضروری ہے(۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ حضرات جن حالات میں مبتلا ہیں، اس کی صورت واضح ہے کہ دونوں ہی جگہ آپ کے اپنے رہائشی مکانات ہیں، جائداد ہے، کبھی اہل وعیال کے ساتھ یہاں رہتے ہیں اور کبھی وہاں۔ ایسی صورت میں بلا اختلاف دونوں مقامات آپ کے لئے وطن اصلی شمار کئے جائیں گے اور دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھنا ضروری ہوگا۔

جو کچھ اس حقیر کی سمجھ میں آیا عرض کیا، آپ چاہیں تو اس تحریر کا حوالہ دے کر دوسرے علماء سے بھی تشفی کرسکتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) ردالمحتار ۲/۶۰۱۔

باب الجمعة

خطبہ کے دوران اردو میں تقریر

دونوں خطبوں کے درمیان عربی کے علاوہ اردو یا کسی دوسری زبان میں وعظ ونصیحت کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس طرح خطبہ دینے میں کوئی کراہت تو نہیں ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

غیر عربی میں خطبۂ جمعہ کے بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں: بعض علماء اسے ناجائز ونادرست کہتے ہیں، بعض دیگر علماء اس کے جواز کے قائل ہیں، دونوں کے پاس دلائل ہیں اور دونوں رایوں کے پیچھے مختلف حکم ومصالح شرعی ہیں(۱)۔ اس مسئلہ کو بہرحال امت کے مابین اختلاف اور نفاق وشقاق کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے۔ اگر حمد ونعت کے الفاظ عربی میں کہہ کر مختصر وعظ وتذکیر اردو میں کہنے کا رواج ہو (یعنی عربی واردو مخلوط خطبہ) یا خالص عربی میں خطبہ کا رواج کسی مسجد میں ہو تو اسی طرح عمل ہونے دیا جائے۔ اس طرح کے معاملہ کو باعث فساد امت کے درمیان نہیں بنایا جائے، ہاں خطبہ میں شعر وشاعری اور غیر ضروری وطویل تقریر سے ضرور احتیاط کی جانی چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

خطبہ کی اذان کے بعد دعا

۱- خطبہ کی اذان کے بعد دعا، مانگی جائے گی کہ نہیں؟

نماز جمعہ فوت ہوجائے تو ظہر کی نماز پڑھے گا؟

۲- جمعہ کی نماز فرض ختم ہونے کے بعد ظہر کی نیت سے نماز پڑھے گا یا جمعہ

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع ردالمحتار ۲/ ۱۸۳، ۲۳۴، عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح الوقایہ، باب الجمعہ ۱/ ۲۴۲، فتاوی دارالعلوم ۵/ ۵۲، ۵۳، ۶۱، مجموع فتاوی ابن باز ۴/ ۳۹۴، ۳۹۵ طبع ریاض۔

کی نیت سے؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- خطبہ کی اذان کا جواب زبان سے دینا یا اذان کے بعد دعا پڑھنا مناسب نہیں ہے، البتہ دل ہی دل میں پڑھ لے، کذا فی الشامی (۱)۔

۲- ظہر کی نیت سے چار رکعت نماز پڑھے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "وينبغي أن لا يجيب بلسانه اتفاقاً في الأذان بين يدي الخطيب" (الدر المختار علی ہامش رد المختار باب الأذان ۲/۰۷ طبع بیروت)، اذان ثانی کے بعد دعا پڑھنا بھی اسی قبیل سے ہے، نیز حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر وغیرہ امام کے خطبہ کے لئے نکلنے کے بعد نماز پڑھنے اور کسی طرح کی گفتگو کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے (مصنف ابن أبي شیبہ ۱/۴۵۷، ۴۵۸)۔

(۲) "(وكذا أهل مصر فاتتهم الجمعة) فإنهم يصلون الظهر بغير أذان ولا إقامة ولا جماعة" (الدر المختار علی ہامش رد المختار ۳/۳۳ طبع بیروت)۔

باب الإمامة

کنوارے شخص کی امامت کا حکم

کنوارے امام کے پیچھے نماز فرض درست ہے یا نہیں؟ اس کی عبادت قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

امام شادی شدہ ہو یا کنوارا، اس کی امامت درست ہے اور جس طرح شادی شدہ کی عبادت قبول ہوتی ہے اسی طرح کنوارے کی بھی (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نابالغ حافظ کی امامت کا حکم

ایک لڑکا تقریباً بارہ تیرہ برس کا ہے، وہ حافظ قرآن ہے، کیا اس کے پیچھے نماز درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

حافظ صاحب اگر بالغ نہیں ہوئے ہیں (یہ بات ان سے دریافت کرلی جائے) تو ان کی امامت درست نہیں (۱)، بعض دفعہ عمر سے بلوغ ہوتا ہے، یعنی کسی کی عمر ۱۵/ برس ہو اور کبھی احتلام

(۱) امامت کی شرائط میں سے شادی شدہ ہونا نہیں ہے، بلکہ امامت کے لئے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو نماز کے احکام کا عالم ہو، قرأت میں بہتر ہو، متقی، عمر دراز، اخلاق مند اور معزز ہو جیسا کہ الدر المختار میں ہے: "(والأحق بالإمامة)...... (الأعلم بأحكام الصلاة)...... (ثم الأحسن تلاوة)...... (للقراءة ثم الأورع)...... الخ" (الدر المختار علی رد المختار ۲/ ۲۹۴، ۲۹۵ طبع بیروت)، البتہ جہاں عمر دراز اور نوجوان کا اجتماع ہو اور دونوں علم وتقوی میں برابر ہوں تو وہاں عمر دراز شخص کو ہی امامت کے لئے پیش کرنا چاہیے، اس کی علت علامہ زیلعی نے یہ لکھی ہے کہ ان کے اندر خشیت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی امامت کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں وغیرہ، تفصیل کے لئے دیکھئے: (رد المختار ۲/ ۲۹۵ طبع بیروت)۔

کے ذریعہ بھی بلوغ کا پتہ چلتا ہے (۲)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اجرت پر امامت کرنے کا حکم

ایک پیش امام کو بیس روپے ماہوار پر تین وقت کی نماز پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا، انہوں نے دو سال تک کام انجام دیا، بعدہ دوسرے سے دو وقت نماز پڑھوا کر ماہ بماہ مشاہرہ لیتے رہے، اٹھارہ سال کے دوران پیش امام صاحب کا مشاہرہ تین سال کا باقی مبلغ ۷۲۰/روپیہ ہوگیا اور اٹھارہ سال تک پیش امام کا ایک وقت نماز نہ پڑھانے کی ڈیوٹی، باقی کے حساب سے پیش امام صاحب کی ڈیوٹی چھ سال باقی ہوتی ہے، اس حساب سے مبلغ ۱۴۴۰/روپیہ زائد لیا، اب دریافت امر یہ ہے کہ مسجد کی رقم ۱۴۴۰/روپیہ امام صاحب نے زائد لیا ہے اور پیش امام صاحب ۷۲۰/روپئے مطالبہ کرتے ہیں، از روئے شریعت مطلع کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق

جب کہ آپ نے امام صاحب کو بیس روپئے ماہوار پر مسجد کا ملازم رکھا اور تین وقت کی نماز پڑھانے کا معاہدہ کیا، اب امام صاحب نے خود یا اپنے نظم کے ذریعہ کسی دوسرے شخص کے ذریعہ سے نماز پڑھوا کر ۱۸/برسوں کی مدت پوری کردی اور اس درمیان میں کسی ذمہ دار نے عدم رضامندی کا اظہار یا معاہدہ ختم کرنے کا اقدام نہیں کیا تو ایسی صورت میں اب امام صاحب کی تنخواہ بہرحال واجب الاداء ہے، اس واجب کو ساقط کرنے کے لئے حیلے نہیں نکالنے چاہئیں (۳)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) "(ولا يصح اقتداء رجل بامرأة) ...... (وصبي مطلقاً) ولو في جنازة ونفل على الأصح" (الدر المختار)، "لأن الإمامة للبالغين: من شروط صحتها البلوغ" (رد المحتار ۲/۳۲۱، ۳۲۲ طبع بیروت)۔

(۲) "(بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال ...... قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة، به يفتى)" (الدر المختار علی رد المحتار ۹/۲۲۵، ۲۲۶ طبع بیروت)۔

(۳) دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ ۴/۴۱۲، ۴۲۵۔

باب تسوية الصفوف

درمیان نماز میں شامل ہونے والا کس طرف کھڑا ہو؟

۱- نماز میں جماعت کے درمیان آنے والا شخص کس طرف کھڑا ہو، دائیں یا بائیں؟

درمیان نماز میں آنے والا جس حال میں امام کو پائے شریک ہوجائے

۲- کوئی فرض نماز ہو رہی ہو تو پیچھے آنے والا شخص پہلے چھوٹی ہوئی رکعتوں کو پڑھے گا یا جماعت کے ساتھ شریک ہوجائے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- جماعت کی نماز شروع ہوجانے کے بعد ملنے والا شخص صف کے دائیں اور بائیں دیکھ کر جس طرف لوگ کم ہوں اس طرف جا کر مل جائے (۱)۔

۲- اگر درمیان نماز میں کوئی آئے تو امام کو جس حال میں پائے اس کے ساتھ شریک ہوجائے، جب امام سلام پھیر دے تو جتنی رکعت نماز چھوٹ گئی ہے اسے ادا کرے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) حدیث میں ہے: "وسطوا الإمام وسدوا الخلل" (سنن أبي داؤد ۱/۹۳۴)، اور رد المحتار میں ہے: "ومتى استوى جانباه يقوم عن يمين الإمام إن امكنه" (رد المحتار باب الإمامة ۲/۳۱۰ طبع بیروت)۔

(۲) اعلاء السنن ۴/۳۳۴۔

باب الجنائز

پیٹ میں مرے ہوئے بچہ کا جنازہ اور تدفین

گذارش عرض ہے کہ ایک حاملہ عورت کے پیٹ سے ڈاکٹر نے مرا ہوا بچہ نکالا، بعدہ قریب ۳ رگھنٹہ کے بعد عورت بھی انتقال کر گئی، اس نعش کو اسپتال سے لاکر دفن کا انتظام کیا گیا، لیکن امام صاحب ایک ہی ساتھ نماز جنازہ پڑھا کر ایک ہی قبر میں دفن کرائے، جب اس پر چند آدمیوں نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ ایسا ہوسکتا ہے، اس پر حکم شرعی کیا ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق

جب بچہ مرا ہوا نکالا گیا تو اس پر نماز جنازہ ہے ہی نہیں، اس لئے غالباً آپ کے امام صاحب نے صرف عورت کی نماز جنازہ پڑھی، البتہ اس بچے کو علاحدہ دفن کرنا چاہئے تھا، اس لئے کہ بلاضرورت مُردوں کو ایک قبر میں دفن نہیں کرنا چاہئے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) عن جابر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: "الطفل لا یصلی علیہ ولا یحث ولا یورث حتی یستھل" (سنن ترمذی، باب ترک الصلاۃ علی الجنین حتی یستھل ۳/۳۵۰ طبع استنبول)، ایسے بچے کا حکم یہی ہے کہ اس کو غسل دیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اس کو کفنایا جائے، البتہ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے، جیسا کہ الدر المختار میں ہے: "(وإلا غسل وسمی)... (وادرج فی خرقۃ ودفن ولم یصل علیہ)" (الدر المختار علی رد المحتار ۳/۱۳۱ طبع بیروت)۔

کتاب الزکاۃ

پراویڈنٹ فنڈ میں جمع شدہ رقم کی زکاۃ

وہ سرکاری ملازمین جن کی تنخواہوں میں سے کچھ رقم وضع کر کے پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کرلیا جاتا ہے اور یہ رقم یا تو اس کے ریٹائرڈ ہونے کے وقت اکٹھا گورنمنٹ کی طرف سے ادا کردی جاتی ہے، یا مرنے کے بعد اس کے وارثان کو دے دی جاتی ہے، اس دوران ملازمت میں اس سرکاری ملازم کو یہ حق ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے بطور دستگرواں بہ وقت ضرورت کچھ رقم لے سکتا ہے، مگر قسط وار اس کی وصولی بھی کرلی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے:

(الف) اس فنڈ میں جمع شدہ رقم پر سال گذرنے کے بعد زکاۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

(ب) اگر بالفرض فی الحال زکاۃ واجب نہیں ہوتی تو کیا اس کے ریٹائرڈ ہونے کے وقت جب یہ کل رقم ملے گی تو اس وقت جس سال اسے ملے گی صرف اسی سال کی زکاۃ واجب ہوگی یا اس پوری ملازمت کی مدت کا سالانہ حساب کیا جائے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق

پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف کے حکم میں ہے، یعنی دین واجب فی الذمہ ہے، لیکن غیر مال کا بدل ہے، جیسے دین مہر یا دیت (۱)۔ پس اس پر زکاۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ رقم وصول

(۱) دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی فروخت شدہ چیز کا ثمن یا نقدی قرض کا بدل نہ ہو، یعنی غیر مال کا بدل ہو جیسے مہر، دیت، بدل کتابت اور بدل خلع وغیرہ، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر آدمی دین ضعیف کے کچھ حصہ پر قبضہ کرلے اس

ہوجائے اور اس پر سال گذر جائے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قرض میں لگی ہوئی رقم کی زکاۃ

زید کے پاس نقد دوسو روپے ہیں اور دوسو اس نے بکر کو قرض دے رکھا ہے، اب سال گذر جانے کے بعد زید صرف دوسو روپیوں کی زکاۃ ادا کرے گا یا ان دو سو روپیوں کی بھی زکاۃ ادا کرے گا جو اس نے بکر کو قرض دے رکھا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

یہ دوسو روپے جو زید نے بکر کو قرض دیئے ہیں یہ دین قوی ہے۔ اگر زید کے پاس والی نقد رقم اور بکر کو دی ہوئی قرض والی رقم ملا کر نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو زکاۃ واجب ہوگئی، لیکن زکاۃ کی ادائیگی قرض کی واپسی پر کرنی ہوگی (۲)، اگر پہلے ادا کرے تو بھی جائز بلکہ بہتر ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

= حال میں کہ اس کے پاس پہلے سے بقدر نصاب مال موجود ہو اور حولان حول بھی ہوجائے تو مال مستفاد کی طرح اس کی بھی اصل مال کے ساتھ ملا کر زکاۃ ادا کی جائے گی، اور اگر پہلے سے وہ مالک نصاب نہیں ہے تو اس وقت تک اس مال پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی جب تک بقدر نصاب مال پر قبضہ نہ کرلے اور اس پر سال نہ گذر جائے، "الدین الضعیف: وهو مالم یکن ثمن مبیع ولا بدلاً لقرض نقد ومثاله المهر والدیة وبدل الکتابة والخلع —" (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳/ ۲۴۰ بحوالہ الدر المختار وحاشیہ ابن عابدین ۲/ ۳۵، ۳۶)۔

(۱) "(و) عند قبض (مائتین مع حولان الحول بعده) أی بعد القبض (من) دین ضعیف" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۳۹ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

(۲) "اعلم أن الدیون عند الإمام ثلاثة: قوي ومتوسط، وضعیف فـ (تجب) زکاتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لکن لا فوراً بل" (عند قبض أربعین درهماً من الدین) القوي کقرض" (الدر المختار علی رد المحتار باب زکاۃ المال ۳/ ۲۳۶)۔

پگڑی اور پیشگی کے طور پر دی ہوئی رقم کی زکاۃ

بخدمت جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب! زید مجدکم

مجلہ بحث ونظر (جنوری تا مارچ کی اشاعت) میں پگڑی کے تعلق سے بحث ومباحثہ شائع ہوا ہے، اسی قبیل سے لیکن مختلف النوع ایک مسئلہ فی زمانہ درپیش ہے، یعنی مکان، دوکان خصوصاً کارخانے کرائے پر اٹھاتے وقت کرائے دار سے مالک مکان، دوکان ایک معتد بہ رقم بطور زر پیشگی (Advance) حاصل کرلیتے ہیں، یہ رقم لاکھ دولاکھ تک بھی پہنچ جاتی ہے اور کرائے کی جگہ خالی کرنے تک مالک مکان کے پاس رہتی ہے اور جگہ خالی کرنے کے موقع پر واپس ملتی ہے، یہ مدت سال دوسال کی بھی ہوسکتی ہے، یا دس بیس سال بھی۔ اس عرصے تک مالک مکان اس رقم سے نفع حاصل کرتا رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس رقم پر زکاۃ کون ادا کرے؟ آپ کا ذہن رسابات کی تہہ تک پہنچ گیا ہوگا، چنانچہ مسئلہ کی مزید وضاحت سے گریز کرتا ہوں، اور اس مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔

الجواب وباللہ التوفیق

محترمی! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، یاد فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔

آپ نے دوسوالات کئے ہیں، آپ کا پہلا سوال کرایہ داری کے ضمن میں زر پیشگی (Advance) کی زکاۃ سے متعلق ہے، میں نے اس مسئلہ پر غور کیا، جو روپے کرایہ دار مالک مکان کو دیتا ہے، وہ رقم اس کے قبضے اور تصرف سے نکل جاتی ہے، اس طرح کہ جب تک وہ مکان/دوکان نہ چھوڑے، وہ رقم واپس نہیں لے سکتا، اس رقم کو "مال ضمار" (۱) یا ڈوبا ہوا تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس

(۱) مال ضمار اس غائب شدہ مال کو کہتے ہیں جس کی واپسی کی امید نہ ہو، "أما الضمار من المال: فهو الغائب الذی لا یرجی عوده، فإذا رجی فلیس بضمار" (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۸/ ۲۱۳ بحوالہ المصباح المنیر

کے قبضہ میں نہیں ہے اور نہ وہ اس پر کوئی تصرف کرسکتا ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وجوب زکاۃ کے لئے "ملک تام" (مکمل ملکیت) ضروری ہے، یعنی وہ شخص اس چیز کا مالک بھی ہو اور وہ اس کے قبضہ میں بھی ہو، اگر ملک ہو، قبضہ نہ ہو یا قبضہ ہو مگر ملک نہ ہو تو اس مال پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی (۱)، البتہ قبضہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے، اور حکمی بھی، جیسے کسی کو قرض دیا ہوا روپیہ اگرچہ حقیقۃً قبضہ میں نہیں ہے، لیکن مانا جائے گا کہ وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے، اور اس پر تصرف کرسکتا ہے، بشرطیکہ مقروض قرضے کا اقرار کرتا ہو، یا اگر انکار کرتا ہو تو قرضہ دینے والے کے پاس اس کا ثبوت موجود ہو، لیکن رہن کی صورت میں جو مال رہن رکھا گیا ہے اگرچہ وہ مالک کی ملکیت میں ہے، لیکن اس کے قبضہ میں نہیں ہے، اس لئے "مال رہن" پر زکاۃ نہیں ہے، مالک پر اس لئے نہیں کہ اس کا قبضہ نہیں اور جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے اس پر اس لئے نہیں کہ وہ قابض تو ہے مگر مالک نہیں (۲)۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ مال جو ضروریات زندگی یا وسائل رزق میں مشغول ہو، اس پر زکاۃ واجب نہیں جیسے رہائشی مکان یا صنعت کار کے آلات اور اس کی مشینیں (۳)۔

میرے نزدیک صورت زیر بحث میں بطور پیشگی (Advance) جو رقم مالک مکان/دوکان

= ۲/۳۳۰، لسان العرب، مشارق الأنوار ۲/۵۸، المغرب ۲/۱۲)۔
اس کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ مال ضمار ہر وہ مال ہے جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو باوجودیکہ اصل ملک قائم ہو، "هو كل مال غير مقدور الانتفاع به مع قيام اصل الملك" (بدائع الصنائع ۲/۹ طبع دار الفکر بیروت)، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲/۲۲۲، رد المحتار ۲/۹۔

(۱) "(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك ...) ... (تام) لأن المراد بالتام: المملوك رقبة ويداً" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۷۴، ۱۷۵ طبع بیروت)، نیز دیکھئے: فتح القدیر ۲/۱۶۳ طبع بیروت۔

(۲) "(ولا في مرهون) أي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة، ولا على الراهن لعدم اليد" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۸۰ طبع بیروت)۔

(۳) "(ولا في ثياب البدن وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) ...... وكذلك آلات المحترفين ...... يساوي نصباً وإن حال الحول" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۸۲، ۱۸۳)۔

کو دی جاتی ہے، اس کی حیثیت رہن کی سی ہے اور اس پر مالک کو "ملک تام" حاصل نہیں اور جس طرح رہن میں جب تک "دین" ادا نہیں کرتا مال رہن کو واپس نہیں لے سکتا، اسی طرح یہاں جب تک مکان، دوکان، کارخانہ خالی نہ کردے، پیشگی میں دی ہوئی رقم کو واپس نہیں لے سکتا، لہذا اس پر زکاۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، مزید براں یہ کہ رہائشی مکان ہو یا تجارتی دوکان ہو، یا صنعتی کارخانہ ہو، اگر کرایہ پر لیا گیا تو وہ رقم جو بطور ایڈوانس (Advance) دی گئی ہے وہ ضروریات اصلیہ یا وسائل رزق میں مشغول ہے، رہائشی مکان تو ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے، دوکان اور کارخانے کے سلسلہ میں جو رقم ایڈوانس (Advance) دی گئی ہے، اس کی وجہ سے وہ دوکان چلا پا رہا ہے، یا کارخانہ چلا رہا ہے اور دوکان وکارخانہ کی آمدنی کی سالانہ بچت اگر نصاب کو پہنچ جائے اسے زکاۃ دینی ہے اور جس طرح دوکان کے فرنیچر، وزن کے آلات، نیز کارخانے کی مشینوں پر اس لئے زکاۃ نہیں ہوتی کہ وہ ذرائع ووسائل ہیں، ان کی حیثیت تجارتی مال کی نہیں، اسی طرح وہ رقم جو دوکان اور کارخانے کو کرایہ پر لینے میں مشغول ہے اسے ان مشینوں کی طرح تصور کیا جانا چاہئے اور ان پر زکاۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔

اس لئے میری رائے میں مکان، دوکان اور کارخانے کی کرایہ داری پر دیا ہوا (ایڈوانس) ایسا مال ہے جو مالک کے قبضہ وتصرف میں نہیں ہے، مال رہن کی طرح ہے، نیز ضروریات ووسائل رزق میں مشغول ہے، اس لئے ان پر بھی زکاۃ واجب نہیں ہوگی، جب وہ رقم واپس آجائے گی تو سال گذرنے پر زکاۃ دینی ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المصارف

کیا فی زمانہ سادات کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موجودہ حالات میں جب کہ بیت المال وغیرہ کا نظام نہیں ہے، سادات کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

موجودہ دور میں کسی ہاشمی کو جو فقیر ہو زکاۃ دینا میرے نزدیک جائز ہے۔

اس بارے میں اصل مسلک تمام ہی علماء کا یہی ہے کہ زکاۃ ہاشمی کو نہیں دی جاسکتی، لیکن اس ظاہر الروایہ اور مشہور مسلک سے الگ ہوکر ایک قول امام ابو یوسفؒ کا یہ منقول ہے کہ ہاشمی کی زکاۃ ہاشمی کو دی جاسکتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ سے ابو عصمہ کی روایت یہ ہے کہ امام صاحبؒ سادات کے لئے علی الاطلاق جواز زکاۃ کے قائل ہیں۔ خواہ زکاۃ ہاشمی کے مال کی ہو یا غیر ہاشمی کے مال کی۔ امام صاحبؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خمس الخمس جو اہل قرابت رسول کے لئے تھا، اب وہ انہیں نہیں ملتا، زکاۃ ان پر حرام قرار دی گئی تھی، لیکن اس کا بدل خمس الخمس مقرر کردیا گیا تھا، اب جب کہ وہ بدل ختم ہوگیا تو اصل یعنی زکاۃ ان کے لئے حلال ہوگی، امام طحاویؒ نے اسی قول کو اختیار ہے، شوافع میں اصطخری اور بعض حنابلہ کی بھی یہی رائے ہے۔

متاخرین علماء ہند میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں فیض الباری میں نقل کیا ہے کہ سادات کا مجبور ہوکر بھیک مانگنے کے مقابلہ میں زکاۃ کھانا آسان تر ہے، لہذا میں بھی یہی فتویٰ دیتا ہوں۔ کفایت المفتی میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کا فتویٰ جواز ہی کا نقل کیا گیا ہے گرچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو اس سے اتفاق نہیں۔

بہر حال قول امام مختلف ہے، امام طحاویؒ اور بعض دیگر علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اختلاف دلیل وبراہین کا نہیں، بلکہ بدلتے ہوئے حالات اور زمانہ کا ہے، اس لئے اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے اس روایت غیر مشہورہ پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

موجودہ حالات یہی ہیں کہ خمس الخمس سادات کو ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عطایا وہدایا کے ذریعہ سادات کی خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے، لہذا میں پوری طمانیت قلب کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ ضرورت مند سادات کو زکاۃ شرعاً دی جاسکتی ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایا جائے، ہدایہ میں لکھا ہے: "ولا تدفع إلى بني هاشم، لقوله عليه السلام يا بني هاشم إن الله تعالىٰ حرّم عليكم غسالة الناس وأوساخهم وعوّضكم منها بخمس الخمس اهـ"(۱)۔

اس کے تحت فتح القدیر میں لکھا ہے: "هذا ظاهر الرواية وروى أبو عصمة عن أبي حنيفة أنه يجوز في هذا الزمان وإن كان ممتنعا في ذلک الزمان وعنه وعن أبي يوسف أنه يجوز أن يدفع بعض بني هاشم إلى بعض زكاتهم"(۲)۔

اور تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں لکھا ہے: "لا إلى ذمي ...أو هاشمي ......وروى أبو عصمة عن أبي حنيفة جواز دفع الزكاة إلى الهاشمي في زمانه وروي عن أبي حنيفة أن الهاشمي يجوز له أن يدفع زكاته إلى الهاشمي"(۳)۔

اسی کے ذیل میں علامہ شلبی حاشیہ تبیین میں فرماتے ہیں: "(قوله روى أبو عصمة عن أبي حنيفة جواز دفع الزكاة) قال الطحاوي هذه الرواية عن أبي حنيفة ليست بالمشهورة اهـ غاية وفي شرح الآثار عن أبي حنيفة لا بأس بالصدقات كلها على بني هاشم والحرمة للعوض وهو خمس الخمس فلما سقط ذلک بموته عليه السلام حلت لهم الصدقة، قال الطحاوي وبه نأخذ وفي النتف يجوز الصرف إلى بني هاشم في قوله خلافا لهما"(۴)۔

---

(۱) الهدایہ ۲/۲۲۶ طبع کراچی۔
(۲) فتح القدیر ۲/۲۷۲ طبع بیروت۔
(۳) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۳۰۳ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔
(۴) حاشیہ شلبی علی تبیین الحقائق ۱/۳۰۳ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

اوردرمختار میں ہے:"ولا إلى بني هاشم ...... (قوله إطلاق المنع) يعني سواء في ذلک کل الأزمان وسواء في ذلک دفع بعضهم لبعض ودفع غيرهم لهم وروى أبو عصمة عن الإمام أنه يجوز الدفع إلى بني هاشم في زمانه لأن عوضها وهو خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم وإيصالها إلى مستحقيها وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض كذا في البحر۔

وقال في النهر: وجوز أبويوسف دفع بعضهم إلى بعض وهو رواية عن الإمام"(۱)۔

کفایۃ میں لکھا ہے:"(ولا تدفع إلى بني هاشم)... الحرمة كانت في عهد النبي ﷺ للعوض وهو خمس الخمس فلما سقط ذلک بموته حلت لهم الصدقة... قال الطحاوي: وبالجواز نأخذ"(۲)۔

اورفیض الباری شرح بخاری میں ہے:"ونقل الطحاوي عن أمالي أبي‌يوسف أنه جاز دفع الزكاة إلى آل النبي ﷺ عند فقدان الخمس فإن في الخمس حقهم فإذا لم يوجد صح صرفها إليهم ـــ وفي البحر عن محمد بن شجاع الثلجي عن أبي حنيفة أيضا جوازه ـــ وفي عقد الجيد أن الرازي أيضاً أفتى بجوازه. قلت: وأخذ الزكاة عندي أسهل من السوال فافتى به أيضا"(۳)۔

اورحاشیہ میں مولانا بدرعالم صاحب تحریر فرماتے ہیں:"نقل العيني عن الاصطخري أيضا أنهم إن منعوا الخمس جاز صرف الزكاة إليهم وروى ابن سماعة عن أبي يوسف أن الزكاة من بني هاشم تحل لبني هاشم، ولا تحل لهم من غيرهم وفي "الينابيع" يجوز للهاشمي أن يدفع زكاته للهاشمي عند أبي حنيفة ولا يجوز عند أبي يوسف وفي

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۸، ۲۹۹ طبع بیروت۔
(۲) الکفایہ مع فتح القدیر ۲/ ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳ طبع رشیدیہ پاکستان۔
(۳) فیض الباری ۳/ ۵۲، طبع مکتبہ حقانیہ پاکستان۔

"جوامع الفقه" يكره للهاشمي عند أبي يوسف خلافاً لمحمد"(۱)۔

اورشرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں:"وقد اختلف عن أبي حنيفة في ذلک، فروي عنه أنه قال لا بأس بالصدقات كلها على بني هاشم، وذهب في ذلک عندنا إلى أن الصدقات إنما كانت حرمت عليهم من أجل ما جعل لهم في الخمس من سهم ذوي القربى فلما انقطع ذلک عنهم ورجع إلى غيرهم بموت رسول الله ﷺ حل لهم بذلک ما قد كان محرما عليهم من أجل ما قد كان أحل لهم وقد حدثني سليمان بن شعيب عن أبيه عن محمد عن أبي يوسف عن أبي حنيفة في ذلک مثل قول أبي يوسف فبهذا نأخذ"(۲)۔

اورفتاویٰ کبریٰ کے اخیر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب "الاختیارات الفقہیہ" میں لکھا ہے:"وبنو هاشم إذا منعوا من خمس الخمس جاز لهم الأخذ من الزكاة وهو قول القاضي يعقوب وغيره من أصحابنا وقاله أبو يوسف والأصطخري من الشافعية لأنه محل حاجة وضرورة"(۳)۔

فدیہ نماز اوراس کا مصرف؟

مکرمی ومحترمی جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم

سلام مسنون

عرض خدمت یہ ہے کہ درج ذیل مسئلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ہدایت ورہنمائی مطلوب ہے، براہ کرام فقہ حنفی کی روشنی میں وضاحت فرمادیں، جزاک اللہ۔

(۱) فیض الباری ۳/ ۵۲، طبع مکتبہ حقانیہ پاکستان۔
(۲) شرح معانی الآثار ۱/ ۳۳۳ طبع المکتبۃ الاشرفیہ دیوبند۔
(۳) مجھے "فتاوی کبری کا وہ نسخہ نہیں مل سکا جس کے اخیر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب "الاختیارات الفقہیہ" چھپی ہوئی ہے، البتہ اب یہ کتاب علیحدہ دارالفکر بیروت سے چھپ گئی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی لائبریری میں نسخہ ہے جس کے ص ۱۰۴ پر یہ عبارت موجود ہے۔

۱- فدیہ نماز (یعنی جو نمازیں ترک ہو چکی ہیں ان کے بدلہ میں فدیہ نکالنا مقصود ہے) کی مقدار کیا ہے؟

۲- فدیہ نماز کا مصرف کیا ہے؟

۳- خاص طور سے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے غریب بچوں پر اس کا استعمال ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- نماز ہر عاقل، بالغ، مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، جو نمازیں چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا ضروری ہے، زندگی میں فدیہ ادا کرنے سے نماز کا وجوب ختم نہیں ہوگا، اس لئے جتنی نمازیں بلوغ کے بعد سے قضا ہوئی ہیں، ان سب کی قضا کی جائے۔ حدیث شریف میں ہے: "من نسی صلاۃ أو نام عنها فكفارتها أن يصليها إذا ذكرها" (۱)، ہاں اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے وصیت کر گیا ہو کہ میری چھوٹی ہوئی نمازوں کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو اس کے ترکہ کے ایک تہائی مال میں سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کیا جائے گا، ہر ایک نماز کے بدلہ نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت فقراء کو دی جائے گی، اسی طرح ہر وتر کے بدلہ بھی نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت غریبوں کو دی جائے گی۔ درمختار میں ہے: "لو مات وعليه صلوات فائتة وأوصى بالكفارة يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر كالفطرة وكذا حكم الوتر والصوم وإنما يعطى من ثلث ماله" (۲)۔

نصف صاع گیہوں موجودہ وزن میں لگ بھگ ایک کلو سات سو گرام کے برابر ہے۔

۲- مذکورہ بالا فدیہ کا مصرف وہی ہے جو زکاۃ وفطرہ کا مصرف ہے (۳)۔

---

(۱) صحیح ۱/۷۷۴ حدیث: ۳۱۵ طبع استنبول۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار، باب قضاء الفوائت ۲/۵۳۲ طبع بیروت۔

(۳) زکاۃ وصدقات کے مصارف قرآن وحدیث میں مصرح ہیں، قرآن کریم میں ہے: "إنما الصدقات للفقراء والمساكين الخ (سورۂ توبہ/۶۰) (صدقات (واجبہ) تو صرف غریبوں کا اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق جو

۳- مدرسہ کے غریب بچوں کو دیا جا سکتا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسکول وکالج کے طلبہ کو زکاۃ کی رقم دینا

محترم قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، میرا نام رضوان اللہ خاں ہے، میں صوبہ بہار کے شہر گیا کا رہنے والا ہوں، گذشتہ دس سالوں سے ظہران یونیورسٹی میں ملازم ہوں، عرض یہ ہے کہ میرے چند ساتھیوں نے بہ شمول میرے غریب طالب علموں کی مالی مدد کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے، جو علی گڑھ میں رجسٹرڈ ہے اس ٹرسٹ کا نام "سرسید اسکالرشپ ٹرسٹ" ہے، اس ٹرسٹ کے تحت علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھنے والے غریب طلباء کی مدد کی جاتی ہے، ہم لوگ پچھلے کئی سالوں سے اس ٹرسٹ کے لئے یہاں پر پیسے جمع کر رہے ہیں۔ کچھ حضرات اپنے زکاۃ کے پیسے بھی دینا چاہتے ہیں، مگر ہم لوگوں نے فی الحال زکاۃ کی رقم لینے کا سلسلہ شروع نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے آپ لوگوں کی رہنمائی چاہئے۔

میرا سوال یہ ہے کہ "کیا زکاۃ کی رقم غریب مسلم طلباء کے پڑھنے کے لئے مالی مدد کے طور پر خرچ کی جا سکتی ہے یا نہیں"؟

آپ کا جواب صاف صاف الفاظ میں ہم لوگوں کو درکار ہے، تاکہ اسی بنیاد پر دوسروں سے بھی رابطہ قائم کیا جا سکے، فقط والسلام۔

الجواب وباللہ التوفیق

زکاۃ کی رقم محتاج اور غریب لوگوں کو دی جا سکتی ہے، سرسید اسکالرشپ کے تحت غریب ومحتاج طلبہ کو مد زکاۃ سے وظیفہ دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ واقعی محتاج ہوں، عام طور پر اس میں دھوکہ

= ان پر مقرر ہیں اور نیز ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے، اور (صدقات کو صرف کیا جائے) گردنوں (کے چھڑانے) میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی امداد) میں)۔

ہوتا ہے، اس لئے پوری تحقیق کرلی جائے، ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں غنی ہے، لیکن علی گڑھ یونیورسٹی یا دیگر بڑے شہروں یا لندن اور امریکہ میں وہاں کے مصارف برداشت نہیں کرسکتا ہو اور اس لئے وہ وظیفہ کا خواہاں ہو، لیکن وہ شریعت کی اصطلاح میں محتاج نہیں، اس لئے اسے زکاۃ نہیں دی جاسکتی۔ فقیر ومحتاج سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بہ قدر نصاب مال نامی نہ ہو یا بہ قدر نصاب مال ہو، لیکن اس کی ضروریات اصلیہ میں مشغول ہو۔

اگر بہ قدر نصاب مال نامی (ایسا مال جس میں اضافہ کے امکانات ہوں، جیسے سونا، چاندی اور مال تجارت) دین سے فارغ ہو تو اس پر زکاۃ واجب ہوتی ہے اور اگر ایسا مال نہ ہو تو زکاۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر مال تو اس کے پاس ہے، لیکن اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لائق ہے، زائد نہیں تو ایسے شخص کے لئے زکاۃ قبول کرنا حلال ہوگا۔

"والحاصل أن النصاب قسمان موجب الزكاة وهو النامي الخالي عن الدين وغير موجب لها وهو غيره فإن كان مستغرقاً بالحاجة لمالكه أباح أخذها وإلا حرّمه الخ (۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

ریلیف کی بچی ہوئی رقم کا مصرف

محترم ومکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

درج ذیل مسئلہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے، براہ کرم مدلل ومفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

ارضی حادثات، سماوی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات کے مواقع پر انسانی ہمدردی رکھنے والی مختلف تنظیموں اور جماعتوں کی جانب سے متاثرین کو راحت اور ریلیف پہنچانے کی خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ عوام سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے اور خیر کا جذبہ رکھنے والے لوگ رقوم واشیاء ضروریہ کی شکل میں تعاون کرتے

(۱) ردالمحتار ۲/۵۸، ۵۹ طبع احیاء التراث العربی بیروت۔

ہیں۔ بعض اوقات ضرورت مندوں میں تقسیم امداد کے بعد کچھ رقم بچ بھی جاتی ہے جو اسی طرح کی آئندہ ضرورت کے لئے محفوظ رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا از روئے شریعت ریلیف کی باقی ماندہ رقم میں سے کسی اور رفاہی، فلاحی اور اجتماعی ضرورت کے لئے اس شرط پر قرض دیا جاسکتا ہے کہ آئندہ ریلیف کی ضرورت کے وقت لازماً قرض کی واپسی کا انتظام کیا جائے گا اور اس کے واضح قرائن بھی موجود ہوں، جزاک اللہ تعالیٰ أحسن الجزاء۔

الجواب وباللہ التوفیق

اصول یہ ہے کہ جو رقوم اور اشیاء ضروریہ جس مصرف کے لئے جمع کی جائیں، اسی مصرف پر خرچ کی جائیں، دوسرا اصول یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اس طرح کی اپیلیں جن ہنگامی حالات کے لئے کی جاتی ہیں انہیں ہنگامی ضرورت پر صرف ہونی چاہئے، اِلا یہ کہ فوری ضرورت کے علاوہ مستقبل کی ضروریات کا بھی اپیل میں تذکرہ کیا جائے۔

بہرحال جو رقوم کسی ہنگامی صورت حال میں برائے ریلیف وراحت رسانی جمع کی جائیں اور اگر اس وقت کی ضرورت کے پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو یہ بچی ہوئی رقوم اس طرح کی کسی مستقبل کی ضرورت کے لئے محفوظ رکھی جائیں، یا پھر کسی قریب ترین مد پر صرف کی جائیں۔ قرض کی جو صورت سوال میں مذکور ہے، بوقت ضرورت اور بشرط احتیاط جائز ہے، لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ بمد ریلیف وراحت رسانی جو رقم آئی ہو، ضرورت مندوں کے رہتے ہوئے بھی ان کو نہ دے کر مستقبل کی ضرورت کے نام پر پیسے جمع رکھ لئے جائیں یہ جائز نہیں ہے، یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اعتبار جنس ضرورت کا ہے، مثلاً سیلاب زدگان کی مدد، فساد زدگان کی مدد، ہوسکتا ہے کہ ایک خاص شہر میں سیلاب آنے پر سیلاب زدگان کی مدد کے لئے امداد طلب کی گئی ہو اور اسی طرح کا سیلاب دوسری جگہ بھی آجائے، بظاہر حال معطی کی نیت سیلاب کی وجہ سے مصیبت زدگان کی امداد واعانت کرنا ہے، شہر یا علاقہ کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اِلا یہ کہ معطی کی طرف سے ایسی کوئی خاص صراحت موجود ہو، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب العشر

(الف) کیا ہندوستان کی موجودہ اراضی پر عشر واجب ہے؟

(ب) عشر وزکاۃ کی ادائیگی اجتماعی ہو یا انفرادی؟

ہندوستان میں عام طور پر جتنی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں وہ غیر مسلموں سے خریدی یا کسی صورت سے حاصل کی گئی ہیں اور اس کا بین ثبوت بھی موجود ہے، کیا ایسی زمینوں پر عشر واجب ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی شرح کیا ہوگی؟ نیز اس کے زیادہ مستحق انفرادی طور پر لوگ ہوں گے یا کوئی خاص ادارہ ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق

(الف) یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہندوستان میں عام طور پر جتنی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، وہ غیر مسلموں سے خریدی گئی ہیں، یا کسی اور طرح حاصل کی گئی ہیں، ہاں اگر حاصل کی گئیں سے آپ کا مطلب مسلم فاتحین کی مفتوحہ اراضی کا حصول ہے تو صحیح ہے، لیکن جن اراضی کو مسلم فاتحین نے فتح کر کے غانمین پر تقسیم کردیا وہ ظاہر ہے کہ عشری ہیں، بلکہ محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر اراضی عشری ہیں، یا ایسی ہیں جن کا حال معلوم نہیں اور پہلی صورت میں تو عشر واجب ہوگا ہی، دوسری صورت میں بھی عشر واجب ہوگا، جب کہ وہ اراضی مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں، اس لئے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے مناسب حال عشر کا وجوب ہی ہے اور عمومات نص بھی اسی کی متقاضی ہیں، ہاں اگر کوئی خاص ایسی زمین ہو جس کے بارے میں علم قطعی حاصل ہو کہ وہ غیر مسلموں سے خریدی گئی ہے تو ایسی صورت میں اس پر عشر واجب نہیں ہوگا'' (۱)۔

(۱) یہ موضوع تفصیل طلب ہے، اس پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور اس موضوع پر سمینار بھی ہو چکا ہے، دیکھئے: کتاب العشر والزکاۃ ر ۲۳۳، جواہر الفقہ، کفایت المفتی ۴ر۲۹۹ تا ۳۰۲، فتاوی دار العلوم ۶ر ۱۶۲، ۱۶۳، امداد الفتاوی ۲ر ۵۹، ۶۰، مجلہ فقہ اسلامی بعنوان اراضی ہند کی شرعی حیثیت اور اسلام کا نظام عشر وخراج۔

(ب) عشر ہو یا زکاۃ، اس کی ادائیگی انفرادی طور پر اسلام کے مزاج اور نظام زکاۃ کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: "خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" (۱) (آپ لیجئے ان کے اموال سے صدقہ) اور حدیث شریف میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جب امیر بنا کر یمن بھیجا تو فرمایا: "تؤخذ من أغنياءهم وترد على فقراءهم" (۲) (ان میں سے جو مالدار اور غنی ہیں ان سے لے کر ان کے فقراء پر خرچ کیا جائے گا)۔ ان تمام تعلیمات اور زکاۃ کے مصارف کے بیان میں "والعاملين عليها" کا ذکر، یہ سارے امور وہ ہیں جو زکاۃ کی اجتماعی ادائیگی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ بہار واڑیسہ میں یہاں مسلمانوں کی شرعی امارت اور ان کے شرعی بیت المال کا نظام قائم ہے، مسلمانوں کے لئے انفرادی عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) سورۂ توبہ ر ۱۰۳۔

(۲) پوری حدیث صحیح بخاری میں ہے: "أن النبي ﷺ بعث معاذاً رضي الله عنه إلى اليمن فقال: ... فاعلمهم أن الله افترض عليهم صدقة في أموالهم تؤخذ من أغنياءهم وترد على فقراءهم" (صحیح البخاری علی فتح الباری ۳ر۲۶۱، حدیث: ۱۳۹۵)۔

کتاب الحج

حج کی ڈیوٹی پر بھیجے جانے والے کا حج

حسب ذیل مسئلہ میں شریعت حقہ کا حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرما کر ممنون فرمائیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے گا۔

ایک شخص حج کے ایام میں حج کی ڈیوٹی پر حکومت کی طرف سے جاتا ہے، لیکن حکومت کا قانون حج کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے، کیا:

وہ شخص بغیر حج کیے ہوئے واپس آجائے، عند اللہ اس کا یہ فعل کیسا ہے؟

اور اگر وہ حج کرتا ہے تو اس حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

سوال میں مذکور صورت حال اور منسلک ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کی خدمت کے لئے کچھ لوگوں کو بھیجا جاتا ہے، انہیں خود حج کرنے سے روکا گیا ہے، اور اس مضمون کا عہد بھی ان سے لکھوایا جاتا ہے، ایسی صورت حال میں عہد کی پابندی لازم ہے، اور ایسے شخص کو حج نہیں کرنا چاہیے، لیکن وہ بغیر احرام میقات میں داخل نہیں ہوسکتا، اور احرام عمرہ یا حج سے ہی ختم ہوگا، لہٰذا سرکار کی طرف سے یہ پابندی درست نہیں ہے، لیکن جب تک یہ پابندی ہے شخص مذکور احرام باندھ کر داخل ہو اور عمرہ کرے پھر وہ حجاج کی خدمت میں لگ جائے، یہ بات واضح رہے کہ باوجود اس ممانعت کے اس نے حج کرلیا تو حج صحیح ہوگا۔

جس نے اپنا حج فرض ادا نہ کیا ہو، کیا وہ حج بدل کرسکتا ہے؟

ایک شخص جس نے اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہے، وہ حج بدل کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ حج بدل کرتا ہے تو کیا "من استطاع إليه سبيلا" کے تحت اس پر حج فرض

ہوجاتا ہے اور وہ تارک فرض قرار پائے گا؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق

بہتر تو یہی ہے کہ حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہے، لیکن اس شخص کو بھی بھیجا جاسکتا ہے جس نے حج نہیں کیا ہے، اور حج آمر کی طرف سے ادا ہوجائے گا، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلا عن نفسه أن يحج رجلا قد حج عن نفسه، ومع هذا لو أحج رجلا لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا وسقط الحج عن الآمر، كذا في المحيط"(۱)۔

اور آیت قرآنی "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" (۲) کے تحت وہ مستطیع قرار نہیں پائے گا اور نہ اس پر حج فرض ہوگا، اس لئے کہ وہ آمر کے خرچ سے وہاں تک پہنچا ہے، چنانچہ حاشیہ مناسک ملا علی قاری میں ہے: "وقال العلامة طاهر سنبل: وكذا لا يثبت الاستطاعة ببذل غيره الزاد والراحلة حتى لا يجب عليه الحج عندنا، وعند الشافعي يجب، ولو امتنع عن البذل يجبر عليه بعد إحرام المبذول له، وقبله لا يجبر، والصحيح قولنا، لأن الاستطاعة لا تثبت إلا بالملك وهو لا يثبت بالبذل والإباحة، لأن للمبيح قدرة المنع عن البذل كذا في المحيط"(۳)۔

---

(۱) الفتاویٰ الہندیہ ۱/۲۵۷۔

(۲) سورۂ آل عمران ۹۷۔

(۳) ارشاد الساری علی ہامش مناسک ملا علی قاری ۲۶۵،۲۶۶۔

کتاب البیوع

دوملکوں کی کرنسیوں کی خرید وفروخت

زید نے بمبئی میں عمرو کو ایک لاکھ روپئے دیئے اور دونوں میں یہ طے پایا کہ آج کے دن کویت میں جو نرخ کویتی دینار اور ہندوستانی روپئے کے باہمی تبادلہ کا ہوگا، اس نرخ کے مطابق عمرو زید کو جب وہ کویت پہنچیں گے، کویتی دینار ادا کریں گے، عمرو کا کہنا ہے کہ اس نے کویت فون کرکے اپنے لڑکے کو کہہ دیا کہ آج کے دن جو نرخ ہو اس کے مطابق ایک لاکھ روپئے کے متبادل کویتی دینار کا چیک تیار کرکے رکھ دو۔ اور جب زید جائیں تو انہیں حوالہ کردو، اسی دوران کویت پر عراق کا حملہ ہوا، زید نہیں جاسکے، اور سارے ہی کویتی دینار بے قیمت ہوگئے۔ عمرو اور اس کا لڑکا سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان واپس آگئے، اب یہ سوال ہے:

''کیا زید کی دی ہوئی رقم روپئے کی شکل میں عمرو کو واپس کرنی پڑے گی یا جو چیک زید کے نام لکھا گیا تھا جو بے قیمت ہوگیا، یہ زید کا نقصان ہوا یا عمرو کا پیسہ ضائع گیا، ممکن ہے کہ موجودہ حالت میں کویتی دینار پھر بازار میں چلنے لگے تو کیا زید کے روپیوں کی قیمت کویتی دینار میں موجودہ نرخ کے اعتبار سے ادا کی جائے گی؟ براہ کرم حکم شرعی سے آگاہ کیا جائے''۔

الجواب وباللہ التوفیق

زید نے عمرو کو ایک لاکھ روپئے آج ادائیگی کے دن کی قیمت پر کویتی دینار کے عوض فروخت کیا، لیکن وہ کویتی دینار اسے ادا نہیں کرسکا۔ چیک کاٹ دینا ادائیگی نہیں۔ اولاً تو چیک اسے حوالہ نہیں کیا، دوسرے یہ کہ چیک بینک میں کیش ہو کر جب تک دوسرے شخص کے اکاؤنٹ میں نہیں

آجائے، ادائیگی شمار نہیں کیا جائے گا، چک کی حیثیت اصل روپئے کی نہیں ہے، بسا اوقات اگر چک دینے والے کے اکاؤنٹ میں اتنے روپئے نہیں ہوں تو چک DISHONER ہوجاتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں عمرو پر واجب ہے کہ وہ ایک لاکھ روپئے زید کو واپس کردے، جو کویتی دینار، حالیہ انقلاب کے دوران بے قیمت ہوکر ضائع ہوئے وہ عمرو کی ملکیت میں رہ کر ضائع ہوئے، اس لئے اس کی ذمہ داری عمرو پر ہے، زید پر نہیں، اور معاملہ اس روز کی قیمت پر طے تھا جس روز زید نے ایک لاکھ روپئے عمرو کو دیئے تھے، لہٰذا کویتی دینار کی موجودہ قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا(۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جانور کی وزن سے خرید وفروخت

ہمارے دیار میں جانور (زندہ) وزن سے بکتے ہیں اور بغیر وزن کے بھی فروخت ہوتے ہیں، بغیر وزن کے خریدنے میں خریدار کو جانور بہت گراں پڑتا ہے اور خریدار کو جانور جانچنے کا سلیقہ نہیں ہوتا، فروخت کرنے والے جانور میں جب گوشت بہت کم دیکھتے ہیں تو بغیر وزن کے فروخت کرتے ہیں، خریدار کو تجربہ نہیں ہوتا اور بھیڑ میں اون بہت زیادہ ہونے پر وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، دھوکا میں آکر خرید لیتا ہے، ذبح کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دھوکا ہوا ہے، آج کل ایسے واقعات بہت کثرت سے ہوتے ہیں کہ تین سو رانڈ میں بھیڑ خرید اتو ۹ رکلو گوشت نکلا، گویا گوشت کا حساب کیا جائے تو فی کلو بتیس، تینتیس رانڈ پڑا،

---

(۱) "لو استدان نقداً معلوماً ثم كسد قبل الأداء فعند أبي حنيفة يجب رد مثله ولو كان كاسداً، لأنه هو الثابت في الذمة لاغيرهُ وعند محمد وبعض الحنابلة يجب على المدين رد قيمة النقد الذي وقع به التعامل من النقد الآخر وقت الكساد وعند أبي يوسف والحنابلة والمالكية: لايجزئ رد المثل بعد ماكسد ويجب على المدين رد قيمة النقد الذين وقع عليه العقد يوم التعامل من نقد آخر" (ہذا ملخص من التفاصیل فی الفتاوی الحمدیہ ۳/۲۲۵، بدائع الصنائع ۷/۳۲۴۴، مجموعہ رسائل ابن عابدین ۲/۶۶ وغیرہ)۔

ورنہ عام طور پر گوشت چودہ سے بیس رانڈ کلو تک فروخت ہوتا ہے، یہ حقیقت بالکل بجا ہے کہ امر الٰہی کی تعمیل کے وقت گوشت وغیرہ کا حساب نہیں لگانا چاہئے، مگر غیر مسلموں کی دھوکا دہی سے عامۃ المسلمین کو بچانا ضروری ہے کہ نہیں؟ اور جب وزن سے خریدنے میں مسلمانوں کو نقصان سے بچانا مقصود ہو تو کیا وزن سے خریدنے کی شرعاً اجازت ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق

جانور عرف عام میں عددی شمار کئے جاتے رہے ہیں، اب عرف میں تبدیلی آئی ہے اور جانوروں کی بیع وزناً بھی ہونے لگی ہے، خود ہندوستان میں بھی کم از کم مرغیوں کی حد تک شہروں میں وزن کر کے بیچنے کا رواج ہو چلا ہے(۱)، مسئلہ زیر بحث ''بیع لحم بالحیوان'' کا نہیں ہے، جو شیخین کے یہاں جائز اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ناجائز ہے(۲)، یہاں روپیہ دے کر جانور وزن کے حساب سے خریدنا ہے، نہ یہاں اتحاد جنس وقدر ہے کہ اس میں شبہ ربا ہو اور نہ کوئی غرر ہے، نہ کوئی ایسی جہالت ہے جو مفضی إلی المنازعت ہو، لہذا اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں، بیع جائز ہے، واضح رہے کہ یہاں بیع گوشت کی نہیں، بلکہ پورے جانور کی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) جن اشیاء کے بارے میں شریعت کی طرف سے کوئی صراحت نہ ہو کہ یہ وزنی ہیں یا کیلی تو وہ اہل شہر کے عرف کے مطابق خرید و فروخت کی جائیں گی، اور عرف کی تبدیلی کی صورت میں خرید و فروخت کے طریقہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے، علامہ عینی نے ''عمدۃ القاری'' میں ''کیلی ووزنی'' کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کل شئ لم ینص علیه الشارع أنه کیلی أو وزنی یعمل فی ذلک علی ما یتعارفه أهل تلک البلدة... لأن الرجوع إلی العرف جملة من القواعد الفقهیة'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۹۷ ۴ طبع پاکستان بحوالہ عمدۃ القاری ۵/ ۵٦۳)، مزید دیکھئے: نظام الفتاوی ۱/ ۲۴۵۔

(۲) اس اختلاف کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدیر مع الہدایہ ۷/ ۲۵، ۲٦، ۲۷، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۴۱۷۔

باب المضاربۃ

مضاربت کے ذریعہ کاروبار

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین مسائل ذیل میں:

۱- متین احمد اور عبد الاحد نے مل کر آج سے ڈیڑھ سال قبل ''ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹمس'' نام کی کمپیوٹر فرم شروع کی تھی، جس کی شکل یہ تھی کہ کمپیوٹر اور اسٹیشنری سامان کا سرمایہ جو کہ تیئیس ہزار سات سو روپیوں کا بنتا تھا یہ متین احمد کا ہوگا اور عبد الاحد صرف محنت کرے گا، فرم سے جو بھی نفع ہوگا دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا، اگر نقصان ہوا تو متین احمد ہی برداشت کرے گا۔

آج ڈیڑھ سال بعد عبد الاحد یہ معاہدہ توڑ کر الگ ہونا چاہتا ہے، جب کہ عبد الاحد کے مطابق اب تک کا نفع ستائیس ہزار رپیوں کا ہوا ہے، لہذا ستائیس ہزار کا نفع آدھا آدھا کیا جائے۔

دوسری طرف متین احمد کا کہنا ہے کہ کمپیوٹر کی قیمت پرانی ہونے کی وجہ سے گر گئی ہے اور اسٹیشنری سامان استعمال ہو چکا ہے، اس لئے تیئیس ہزار سات سو کا جو سرمایہ ہے اس کو پہلے نقد کیا جائے، اگر نقد کرنے کے بعد تیئیس ہزار سات سو روپے میں کمی آتی ہے تو نفع کی رقم سے اس کی بھرپائی کی جائے، اس کے بعد جو بھی نفع بچ جاتا ہے اس کو آدھا آدھا تقسیم کیا جائے۔

۲- اسی کاروبار کے درمیان تقریباً ٦، ۷/ ماہ قبل عبد الاحد نے اس فرم کا نام جو ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹم تھا، تبدیل کر کے ''ڈیٹا بیس کمپیوٹرس اینڈ ڈیلی کمیونی کیشن سسٹم'' رکھا، پھر اسی نام سے لائسنس، رسیدیں اور لیٹر پیڈ بھی بنا لیا، پھر آرڈر کے مطابق باہر سے سامان خرید کر فرم میں یکجا کیا اور پھر ایک سال کی ذمہ داری پر اسی فرم کے ذریعہ فروخت کیا۔ متین احمد یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کاروبار میں وہ برابر

کا شریک ہے، کیونکہ کاروبار کے لئے جگہ، ٹیلی فون اور کمپیوٹر یہ ساری امانتیں متین احمد کی ہی استعمال ہو رہی تھیں۔

اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں نفع کس طرح تقسیم ہوگا؟

۳-زید اور سعد نے مل کر کمپیوٹر کلاسیز شروع کی تھی، اس کی نوعیت یہ تھی کہ زید کا پورا مال ہوگا اور وہ ساری چیزوں کا مالک ہے جب کہ سعد اس کلاس میں پڑھانے اور سنبھالنے کا کام کرے گا، یہاں منافع کی تقسیم یوں ہوگی کہ جو بھی رقم آئے گی برابر تقسیم ہوگی اور نقصان صرف رب المال کا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ سعد اس کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہے تو الگ ہونے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق

آپ کے سوال کی عبارت سے ہم ایسا سمجھتے ہیں:

۱-ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹمس نامی فرم قائم کرتے وقت آپ کے اور عبد الاحد صاحب کے درمیان یہ طے پایا کہ اس فرم کے لئے کمپیوٹرس اور اسٹیشنری پر تیئیس ہزار سات سو روپے خرچ ہوں گے جو آپ کو دینا ہوگا اور اس فرم کو چلانے کا کام عبد الاحد صاحب کریں گے، بنیادی سرمایہ تیئیس ہزار سات روپے آپ نے دیئے جس سے کمپیوٹر وغیرہ دیگر ضروری سامان خریدے گئے اور عبد الاحد صاحب نے اس کو چلایا، اس کے نتیجہ میں ستائیس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی، یہ فرم قائم کرتے وقت یہ معاہدہ ہوا تھا کہ منافع آدھا آدھا ہوگا، اگر کوئی نقصان ہوا تو وہ آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر معاملہ کی یہی صورت ہے جو ہم نے سمجھی ہے تو یہ مضاربت ہے، آپ ''رب المال'' ہیں، عبد الاحد ''مضارب'' ہیں، تیئیس ہزار سات سو کا سرمایہ نقد ''مال مضاربت'' ہے(۱) اور ۲۷ ہزار

(۱) مضاربت "ضاربه له في المال وبالمال" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے: کسی کے مال سے تجارت کرنا اور نفع میں شریک ہونا، حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ نے بھی تقریباً یہی تعریف کی ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط پر مال دے کہ وہ محنت ومزدوری کرکے جو منافع حاصل کرے گا اس میں دونوں شریک ہوں گے، عرفها

روپے منافع ہوئے، اصول مضاربت کے مطابق ''مضارب شروع میں امین ہوتا ہے اور بعد کو شریک ہوتا ہے''(۱)۔

اب جب کہ یہ معاہدہ ختم ہوتا ہے، کمپیوٹر اور فرم کے دیگر سامانوں کی قیمت لگائی جائے اور اس کو ستائیس ہزار منافع کے ساتھ جوڑ دیا جائے، اس میں سے تیئیس ہزار سات سو روپے اصلی پونجی آپ کو بحیثیت رب المال واپس کیا جائے، باقی جو بچ جائے وہ منافعہ قرار پائے گا، اس میں آپ دونوں آدھے آدھے کے حصہ دار قرار پائیں گے۔

۲-''ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹمس'' فرم کا نام تبدیل کرکے ''ڈیٹا بیس کمپیوٹرس اینڈ ٹیلی کمیونی کیشن سسٹم'' رکھنا اس سے حقیقت اور حقیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی جب کہ آرڈر کے مطابق سامان خرید کر کے اسی فرم کے ذریعہ سامان سپلائی کیا گیا، اسی فرم کی جگہ، فون اور کمپیوٹر اس نئے کاروبار کے لئے استعمال کیا گیا تو یہ سابق معاملہ کا ہی ایک حصہ مانا جائے گا اور اس کے منافع بھی ہر دو کے مابین برابر تقسیم ہوں گے۔

= الحنفية بأنها شركة في الربح بمال من جانب وعمل من جانب" (ردالمحتار ۸/ ۴۳۰، مجمع الأنہر ۲/ ۳۲۱)۔

وعرفها المالكية بأنها: تمكين مال لمن يتجر به من ربحه" وعرفها الشافعية بأنها: أن يدفع إليه مالاً ليتجر فيه والربح مشترک" (ردالمحتار ۸/ ۴۳۰ طبع بیروت بحوالہ أسهل المدارک ۲/ ۳۴، الإشراف ۲/ ۷)، لیکن حنابلہ نے مزید قید لگاتے ہوئے یہ تعریف کی ہے: مضاربت یہ ہے کہ صاحب مال اپنے مال کی ایک خاص مقدار کسی کے حوالے اس شرط پر کردے کہ وہ اس مال سے تجارت کرے اور اس کے نفع میں سے ایک مقررہ حصہ کا وہ شریک ہوگا، اس میں ضروری ہے کہ سرمایہ نقدی سکوں کی شکل میں ہو، "هي دفع مال وما في معناه معين معلوم قدره إلى من يتجر فيه بجزء معلوم من ربحه له أو لعبده أو لأجنبي مع عمل منه" (المغنی ۵/ ۵۲ بحوالہ ردالمحتار ۸/ ۴۳۰، کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعہ، باب المضاربہ)۔

(۱) قال صاحب الكافي: "المضارب أمين أولاً وإذا ربح فهو شريک فيه لتملكه جزئا من المال بعمله" (الہدایہ مع البنایہ علی فتح القدیر ۸/ ۴۶۸)۔

جو گفتگو عبدالاحد اور متین کے درمیان اس معاملہ کے بارے میں سوال میں لکھی گئی ہے، وہ متفق علیہ نہیں ہے۔ مزید براں یہ کہ پوری فرم جس کاروبار کے لئے استعمال کی گئی ہے، اصولی طور پر اس فرم کے اصل مالک کو اس کے منافع سے محروم رکھنا خلاف عدل ہے۔

۳- زید اور سعد نے مل کر جو باہم معاہدہ کیا اگر دونوں اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ اب تک کی آمدنی کو برابر برابر تقسیم کرلیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب القضایا المعاصرہ

(مروجہ معاملات کے احکام)

قرض پر کرنسی کی قیمت گرنے کا اثر

مجلّہ بحث ونظر (جنوری تا مارچ) میں کرنسی (Currency) کے تعلق سے فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے، اس سلسلہ میں سود سے متعلق ایک بات کھٹکتی ہے، آپ جانتے ہیں کہ فی زمانہ اشیاء کی قیمتیں کس تیزی سے بڑھ رہی ہیں، گویا جست لگا کر اوپر کی طرف جارہی ہیں، لہٰذا کرنسی یا روپے کی آج جو قوت خرید ہے وہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے، سود کو حرام قرار دینے کا مقصد روپے سے روپے کمانے یا نفع اٹھانے سے روکنا ہے، لیکن آج بغیر سود کے کسی کو قرض دیں اور ایک مدت کے بعد واپس حاصل کریں تو اس رقم کی قوت خرید اتنی گر جاتی ہے کہ نفع نہ اٹھانے کی بات سے قطع نظر لامحالہ الٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور قرض دینے والا خسارے میں رہتا ہے، کیا اس صورت حال کا کچھ مداوا ہوسکتا ہے؟ یا اس خسارے کو برداشت کرنا ہے؟

متذکرہ نقصان دہ صورت حال سے ایک حد تک بچ نکلنے کے لئے کیا یہ بات جائز ہے کہ قرض دینے والا بجائے نقد رقم کے، سونے کی شکل میں اس شرط پر قرض دے کہ مدت قرض ختم ہونے کے بعد اسی معیار اور اسی وزن کا سونا واپس کیا جائے چاہے مدت قرض کتنی ہی کیوں نہ ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق

آپ کا سوال ''کرنسی کی قیمتوں کے کم ہونے سے متعلق'' ہے، یہ بات بالکل جائز ہے کہ بجائے کرنسی کے قرض میں سونا یا چاندی دیا جائے اور مدت پوری ہونے پر اسی مقدار میں سونا چاندی واپس لیا جائے، ایسا نہ ہو کہ دیا جائے روپیہ اور متعین کیا جائے سونا یا چاندی، جو دیں وہی لیں، اور قرض کی حد تک جائز ہے بیع میں نہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

دلال کی اجرت

زمین کی خرید وفروخت میں زمین بیچنے اور خریدنے والے کے علاوہ ایک تیسرا فریق دلال بھی ہوتا ہے جو زمین بیچنے والے اور زمین خریدنے والے میں رابطہ قائم کراتا ہے، اس کے عوض میں وہ کچھ رقم (دلالی) لیتا ہے۔ اس رقم کا پتہ زمین خریدنے یا بیچنے والے کے علم میں کبھی ہوتا ہے، کبھی نہیں۔ کبھی یہ رقم زمین بیچنے یا خریدنے والے دونوں سے وصول کی جاتی ہے۔ اس کا پتہ کبھی دونوں فریق کو ہوتا ہے، کبھی ایک فریق کو، زمین کی طرح دکان بیچنے اور خریدنے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا یہ دلالی کی رقم شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

دلالی کا عام رواج ہے۔ کثرت سے اس پر لوگوں کا عمل ہے، اس لئے کثرت تعامل کی بنیاد پر اس کی اجرت جائز قرار پائے گی۔ اگرچہ اصل کے اعتبار سے دلالی پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''تاتارخانیہ میں لکھا ہے کہ دلال کے لیے اجر مثل یا وہ رقم جس پر اصحاب معاملہ کا اتفاق ہوجائے واجب ہوگی۔ مثلاً یہ کہ دس دینار میں اتنی رقم واجب ہوگی تو یہ حرام ہے اور حاوی میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ دلال کی اجرت اپنی اصل کے لحاظ سے فاسد ہے مگر کثرت تعامل کی وجہ سے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ بہت سی چیزیں جو ناجائز ہیں مگر بربنائے حاجت انہیں جائز قرار دیا گیا ہے جیسا کہ حمام وغیرہ میں داخل ہونے کا مسئلہ ہے''(۱)۔

(۱) ''وقال فی التاتار خانیة: وفی الدلال و السمسار یجب أجر المثل، وما تواضعوا علیه أن فی کل عشرة دنانیر کذا فذلک حرام علیهم وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن کان فی الأصل فاسداً لکثرة التعامل، و کثیر من هذا غیر جائز فجوزوہ لحاجة الناس إلیه کدخول الحمام'' (رد المحتار ۹/۸۷ طبع بیروت)۔

کیا یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں سرمایہ لگانا جائز ہے؟ اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے سود پر رقم لگانا کیسا ہے؟

خدمت عالی میں گذارش یہ ہے کہ حکومت ہند کی جانب سے منظور شدہ ایک عوامی ادارہ ہے، جس کا نام ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' ہے، یہ ادارہ عوام کے فائدہ کے لئے وجود میں آیا ہے، یہ ادارہ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر اس کو مختلف قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے، پھر اس سرمایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ہر سال مالک سرمایہ کے سرمایہ پر کچھ فیصدی نفع طے کرکے اس کو سالانہ تقسیم کرتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ادارہ کے منتظمین سرمایہ داروں کا سرمایہ جن کاروبار میں لگاتے ہیں ان میں سے اکثر سودی طریقہ پر لگاتے ہیں، اور ان کے کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع شرعاً سود ہی ہوتا ہے، جیسا کہ کچھ سرمایہ کمپنیوں کے پریفرنس شیئرز اور ڈبینچر شیئرز میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ سرکاری بینکوں کی فکس ڈپازٹس اور بونڈس میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ سرکاری سودی سرٹیفکیٹ اور وکاس پتروں میں لگاتے ہیں، بیمہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے آمدنی کے ذرائع کھڑے کرنے کی غرض سے لوگوں سے چندہ کرکے سرمایہ جمع کرے اور اس چندہ کی رقم کو آمدنی حاصل کرنے کے لئے مذکورہ ادارہ ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' میں لگائے اور یونٹ ٹرسٹ سے جو نفع حاصل ہو اس کو محتاجوں میں تقسیم کرے تو سوال یہ ہے کہ اس غرض سے چندہ کرنا اور پھر اس کو مذکورہ یونٹ ٹرسٹ میں لگا کر اس سے نفع حاصل کرنا پھر نفع کی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

آپ کی تحریر کے مطابق ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' کا کاروبار سودی ہے اور وہ انہی سودی تجارتوں میں اپنا سرمایہ لگا کر سود بنام منافع کماتا ہے اور اپنے شیر ہولڈرس یا اپنے کھاتہ داروں کو بنام منافع کچھ آمدنی ادا کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ کھاتہ داروں کے ساتھ اس کا معاملہ سودی ہے یا غیر سودی۔ جب کہ ادارہ کھاتہ داروں سے جمع شدہ رقم کو سودی کاروبار میں لگا کر منافع کھاتہ داروں کو دیتا ہے تو یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ادارہ سودی کاروبار کے لئے گویا کھاتہ داروں کا وکیل اور ایجنٹ ہے اور سودی کاروبار اصالۃً (براہ راست) یا وکالۃً (بالواسطہ) کیا جائے، بہر صورت حرام ہے(۱)۔

دوسری بات لحاظ میں رکھی جانی چاہئے کہ کسی عمل کی حرمت اور برائی اس لئے دور نہیں ہو جائے گی کہ اس کا مقصد اچھا ہے اور نہ نیک مقصد کی خاطر حرام ذرائع کا استعمال کرنا صحیح ہے، کوئی چوری، ڈکیتی اور بدکاری اس لئے کرے کہ اس کی آمدنی سے غریبوں کی مدد کی جائے گی، ظاہر ہے کہ اسے صحیح نہیں کہا جائے گا، لہٰذا سوال میں مذکورہ چندہ اور یونٹ ٹرسٹ میں لگا کر منافع حاصل کرنا، چاہے اس کی آمدنی غریبوں کے لئے ہی ہو، جائز نہیں ہے(۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حرام مال اور اس سے کمایا ہوا نفع

سب سے پہلے میں اپنا مختصر سا تعارف کراؤں، تاکہ آپ کو پتہ چلے کہ کس قسم کے شخص نے آپ سے مخاطبت کی ہے، میں ایک سنی مسلمان ہوں جو کچھ عرصہ پہلے تک اسلام کو پسند تو کرتا تھا مگر اسلامی زندگی سے کوسوں دور تھا۔ آخرت کی فکر

(۱) "عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدہ" (سنن أبي داؤد ۳/۶۲۸ طبع استنبول) تفصیل کے لئے دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن ۳/۲۳۶۔

(۲) "وفیہ تقیید لقول الظھیریۃ: رجل دفع إلی فقیر من المال الحرام شیئاً یرجو بہ الثواب یکفر (إنما یکفر إذا تصدق بالحرام القطعي) أي مع رجاء الثواب الناشيء عن استحلالہ کما مر" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۱۹)۔

کے سامنے دنیاوی فکر غالب تھی، ہر وہ چیز بے چوں وچرا کر گذرتا جس کو اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ نے منع کیا تھا، لیکن تقریباً تین سال ہو گئے مجھ میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنی شروع ہوئی اور اس سال رب العزت نے حج کی سعادت سے نوازا۔ مکہ میں میں نے آپ کی آمد کی خبر سنی، میں ان تین برسوں میں بڑا ہی پریشان رہا۔ ایک بات دل میں چبھ رہی تھی اور مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ کسی عالم سے رجوع کر کے اپنی چبھن کو دل سے نکال دوں، آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی، مگر وقت ساتھ نہ دے سکا۔ البتہ آپ کا پتہ مجھے ایک دوست کے ذریعہ مل گیا جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہے، میرے دل میں بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں جس کے جواب کا یہ ناچیز آپ سے طلب گار ہے، مجھے امید ہے کہ آپ مجھے ہرگز مایوس نہ کریں گے، اس کے لئے مجھے میری آپ بیتی ایک طرح سے عیب آپ پر ظاہر کرنی ہوگی، اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے، ویسے ہمارے گاؤں میں علماء ہیں، مگر میں ان کے سامنے اپنا عیب ظاہر کر کے زندگی کے باقی دن ان کو منہ دکھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے آج تک کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدل رہا ہوں۔

میری کہانی ۱۹۷۶ء سے شروع ہوتی ہے جب میں ذریعہ معاش کے لئے بڑی تکلیفیں اٹھا کر یہاں آیا تھا، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود خاطر خواہ نوکری نہیں ملی، اس لئے ایک دکان میں Sales Man کی حیثیت سے کام مل گیا، ہمارا مالک بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ دو تین مہینے میں ہی میں نے اپنے ایک دوست کو اسی دکان میں بلوایا، جب ہم یہاں آئے تھے تو ایک جوش اور ولولہ لے کر آئے تھے کہ ہم زندگی میں کچھ کر دکھائیں گے، ہم نے اپنی ہی دکان کھولنے کی سوچا، تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی، اس لئے ہم نے اپنے محسن کے دکان سے چوری شروع کی، کافی رقم جمع کر کے اپنے تنخواہ کے پیسے کے ساتھ ملا کر ایک چھوٹی سی دکان لی۔ دکان

خوب چمکی، اس دوران میں نے اسی چوری کے پیسوں سے ایک گھر بھی بنایا، پھر ہم دونوں نے نوکری چھوڑ دی اور کام میں جٹ گئے، ایک سے دو اور دو سے تین کرتے کرتے، آج ہماری سات دکانیں ہیں، ہم نے خوب ترقی کی ہے، سماج میں بہت عزت ہے، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوگیا کہ تقریباً تین سال ہوگئے میری یہ تجارت مجھے بوجھ محسوس ہونے لگی، میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا، عذاب قبر اور جہنم کی آگ سے ڈر محسوس ہونے لگا، دل میں رنج ہونے لگا کہ یا اللہ یہ میں نے کیا کیا؟ حرام کی کمائی سے اپنے پیارے والدین، بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہوں، زکاۃ اسی میں سے دے رہا ہوں، صدقہ اسی سے کر رہا ہوں، یا اللہ مجھے کتنا بڑا عذاب ہوگا۔ سوچ کر ہی دل کانپنے لگا، اس وقت سے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ، اللہ کے راستے کی طرف چل پڑا، نماز نہیں پڑھتا تھا گھر میں شروع کی، وہ غلط لگا تو مسجد میں پڑھنے لگا، قضا کیا کرتا تھا وہ بھی چھوڑ دیا، جماعت کا اہتمام نہیں تھا وہ بھی شروع کیا۔

تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے میرے گناہ کے لئے کفارہ ادا کرنا ہوگا؟ کیا میری نمازیں جو چھوٹ گئی ہیں وہ معاف نہ ہوئی ہوں گی؟ کیا اگر جتنا پیسہ میں نے چوری کیا ہے اتنا اگر نکال کر کسی غریب کو دوں تو معافی مل سکتی ہے؟ ورنہ میری کمائی کیا حلال نہ ہوگی؟

اب مجھے اگلا قدم کیسے اٹھانا ہے؟ اگر آپ مجھے جلد از جلد معلوم کرائیں تو عین نوازش ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق

مکرمی! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، حالات جان کر افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ ماضی کے

حالات پر افسوس ہوا اور حال کی ندامت پر مسرت ہوئی، انشاء اللہ آپ کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا، آپ میرا خط ملتے ہی پہلے اس کا تخمینہ کریں کہ بنیادی رقم جو مالک کے یہاں سے لی گئی وہ کتنی تھی، پھر اتنی رقم کا ڈرافٹ یک مشت یا متعدد اقساط میں بلا اظہار نام مالک کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جائے، اس طرح اصل واجب رقم سے بری الذمہ ہوجائیں گے۔

دوسرا مسئلہ اس نفع کا ہے جو اس آمدنی سے کمایا گیا ہے تو اگرچہ امام ابویوسفؒ ضمان اور اصل مال کی ادائیگی کے بعد اس نفع کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ نفع ایک ذریعۂ حرام وخبیث سے پیدا ہوا ہے، اس لئے یہ پاک نہیں ہوسکتا اور اس کا صدقہ کرنا واجب ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے، اس لئے چاہئے یہ کہ اب تک جتنا نفع کما چکے ہیں اس کا تخمینہ کرلیں اور پکا ارادہ کرلیں کہ اتنی رقم آہستہ آہستہ صدقہ کردیں گے، پھر ماہوار ایک قسط اپنے اوپر ادائیگی کے لئے لازم کرلیں اور پابندی کے ساتھ صدقہ کرتے رہیں، یہ صدقہ بہ نیت ثواب نہیں ہوگا، بلکہ اپنے کو پاک کرنے کی نیت سے ہوگا، انشاء اللہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا، توبہ قبول فرمائے گا اور جو دکان، مکان اور دوسری املاک حاصل کی گئی ہیں، وہ حلال ہوجائیں گی، خلاصہ یہ کہ:

اولاً: مالک کے اصل سرمایہ کی ادائیگی جس کے لئے نام کا اظہار بھی ضروری نہیں۔

ثانیاً: اس مال حرام سے کمائے ہوئے نفع کو صدقہ کرنا، جس کے لئے حاصل کردہ منافع کی قیمت کا تخمینہ کرنا اور اتنے روپے آہستہ آہستہ قسط وار ادا کرنا۔

اور ان سب کے ساتھ ساتھ بار بار اللہ تعالیٰ سے عجز وزاری اور اس سے معافی طلب کرنا، اس سلسلہ میں فقہ کی مندرجہ ذیل عبارتوں کو پیش نظر رکھیں:

الغصب ... في الشريعة أخذ مال متقوم محترم بغير إذن المالك على وجه يزيل يده ... ثم إن كان مع العلم فحكمه المأثم والمغرم وإن كان بدونه فالضمان(۱)۔

ومن غصب ألفاً فاشترى بها جارية فباعها بألفين ثم اشترى بالألفين

(۱) ہدایہ ۳/۳۵۱۔

جارية فباعها بثلاثة آلاف درهم، فإنه يتصدق بجميع الربح، وهذا عندهما وأصله أن الغاصب أو المودع إذا تصرف في المغصوب أو الوديعة وربح لا يطيب له الربح، عندهما خلافا لأبي يوسفؒ ...... وقال مشائخنا ولا يطيب له قبل أن يضمن وكذا بعد الضمان بكل حال، وهو المختار لإطلاق الجواب في الجامعين والمبسوط(۱)۔

لأبي يوسفؒ أنه حصل في ضمانه وملكه، أما الضمان فظاهر، وكذلك الملك في المضمون لأن المضمونات تملك بأداء الضمان مستندًا إلى وقت الغصب عندنا، ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في مال الغير وما هذا حاله فسبيله التصدق، إذا الفرع يحصل على وصف الأصل والملك المستند ناقص فلا ينعدم به الخبث(۲)۔

خلاصہ ان عبارتوں کا یہ ہے کہ ''مالک کی اجازت کے بغیر مال متقوم ومحترم لے لینا، اس طرح کہ اصل مالک کا قبضہ ختم ہوجائے'' غصب ہے، اگر جان بوجھ کر دوسرے کا مال لے لیا تو گنہگار بھی ہوگا اور ضمان بھی دینا ہوگا اور اگر غلطی سے بغیر علم کے کسی کا مال لے لیا ہو تو ضمان دینا ہوگا، گناہ نہیں ہوگا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کے مثلاً ہزار روپے غصب کرلئے اور ان ہزار روپیوں سے کوئی سامان تجارت خرید لیا اور اسے فروخت کرکے دو ہزار بنالئے، پھر اور مال خریدا اور اس سے مزید نفع کمایا تو اصل مالک کو اسے ضمان دینا ہوگا ہی، ساتھ ہی ساتھ یہ پورا نفع بھی اسے صدقہ کردینا ہوگا، یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک منافع کا صدقہ کرنا واجب نہیں، بلکہ ضمان ادا کرنے کے بعد یہ منافع اس کے لئے حلال ہوجائیں گے، مشائخ علماء احناف کا کہنا یہ ہے کہ ضمان ادا کرنے سے پہلے بھی اور ضمان ادا کرنے کے بعد بھی یہ منافع اس کے لئے پاک نہیں ہوں گے اور یہی قول مختار ہے۔

---

(۱) ہدایہ ۳/۵۶ء۔

(۲) ہدایہ ۳/۵۵ء۔

امام ابو یوسفؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ منافع اسے اس مال کے ذریعہ حاصل ہوا ہے جس کا ضمان ادا کرنا اس کے لئے واجب ہے اور جس مال کا ضمان ادا کرنا پڑے وہ مال ادا، ضمان کے بعد وقت غصب سے اس کی ملک قرار دیا جائے گا، امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کا کہنا ہے کہ ذریعہ آمدنی حرام اور ناپاک ہے، اس لئے اسے صدقہ کرنا واجب ہے اور اصل مال حرام تھا، اس لئے فرع (منافع) بھی حرام ہوگا، رہا سوال ملک کا تو وہ ملک ناقص ہے، اس لئے اس کی وجہ سے اس کی ناپاکی دور نہیں ہوگی''، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب النکاح

بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح حرام ہے

لکھنا ضروری یہ ہے کہ جناب یونس صاحب کی بیوی دنیا میں زندہ ہے اور وہ اپنی سگی سالی سے شادی کرنا چاہتا ہے، یعنی اس نے سالی کو گھر والی بنا کر اس سے زنا بھی کیا ہے، یہ غلط معاملہ آج سے نہیں بلکہ ۶/سال سے ہے اور یونس صاحب کا کہنا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گا یعنی سالی سے۔ اس حال میں کیا کریں، شریعت میں اس کا حکم کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

ایک خاتون کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا" (۱) (اور حرام ہے کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

اور جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "أن أم حبيبة زوج النبي ﷺ حدثتها أنها قالت لرسول الله يا رسول الله: انكح أختي عزة فقال رسول الله ﷺ: "أتحبين ذلك" فقالت: نعم يا رسول الله لست لك بمخلية وأحب من شركني في خير أختي فقال رسول الله: فإن ذلك لا يحل لي" (۲) (حضرت ام حبیبہ ام المؤمنین نے آنحضور ﷺ سے کہا کہ آپ میری بہن عزہ سے نکاح کر لیں، تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم کو یہ پسند ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں، یا رسول اللہ! میں جانتی ہوں کہ میں تنہا آپ کی

(۱) سورۂ نساء/ ۲۳۔
(۲) الصحیح للبخاری ۶/ ۱۲۷، ۱۲۸، الصحیح لمسلم ۲/ ۱۰۷۳، حدیث: ۱۴۴۹ طبع استنبول۔

زوجیت میں نہیں رہوں گی اور کسی خیر میں میرے ساتھ میری بہن شریک ہو، یہ میرے لئے زیادہ پسند ہے، تب حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرے لئے حلال نہیں)۔

اور ہدایہ میں ہے: "ولا يجمع بين أختين نكاحا ولا بملك يمين وطأ" (۱)۔

لہذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص یونس کے لئے اپنی بیوی کے زندہ اور اس کی زوجیت میں موجود ہوتے ہوئے، بیوی کی بہن سے شادی کرنا شرعاً قطعاً حرام ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح حرام ہے

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں:

حمیدہ خاتون کے پاس چھ لڑکے ہیں، محمد توقیر، حفظ الرحمن، محمد توفیق، محمد رضوان، محمد غفران اور محمد ذیشان۔

حمیدہ خاتون نے اپنی نند ریحانہ خاتون کے لڑکا برکت اللہ کو محمد توقیر جب دودھ پی رہا تھا اس وقت ایک دن دودھ پلایا تھا، اب حمیدہ خاتون اپنے بڑے لڑکے محمد توقیر کی شادی ریحانہ خاتون کی لڑکی سے جو برکت اللہ سے چھوٹی ہے کرنا چاہتی ہے۔ یہ رشتہ جائز ہے یا ناجائز؟ نیز یہ کہ برکت اللہ کی شادی توقیر کی کسی بہن سے ہو سکتی ہے یا نہیں۔

جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

رضاعت کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کوئی بچہ مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو وہ بچہ اس عورت کا رضاعی بیٹا یا بیٹی اور وہ عورت رضاعی ماں ہو جاتی ہے، اور اس عورت کی تمام اولاد دودھ پینے والے بچے کے رضاعی بھائی بہن ہو جاتے ہیں، اس لئے اس بچہ کی شادی دودھ شریک بھائی بہن کا رشتہ قائم ہونے کی وجہ سے، دودھ پلانے والی عورت کی

(۱) الہدایہ مع فتح القدیر ۳/ ۲۰۳ طبع بیروت۔

کسی بھی اولاد سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، ایک ہی شوہر سے ہو یا دوسرے سے، شرعاً حرام ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ"(۱)۔

اور حدیث شریف میں ہے: "ويحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب"(۲)۔

نیز فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "ويحرم على الرضيع أبواه من الرضاع وأصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جميعًا حتى أن المرضعة لو ولدت من هذا الرجل أو غيره قبل هذا الإرضاع أو بعده ...... فالكل إخوة الرضيع وأخواته"(۳)۔

اور بدائع الصنائع میں ہے: "والأصل في ذلك أن كل اثنين اجتمعا على ثدي واحد صارا أخوين أو أختين أو أخا وأختا من الرضاعة فلا يجوز لأحدهما أن يتزوج بالآخر ولا بولده كما في النسب"(۴)۔

لہٰذا مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں صورت مسئلہ میں برکت اللہ نے چونکہ محمد توقیر کی والدہ کا دودھ پیا ہے، اس لئے برکت اللہ کی شادی محمد توقیر کی کسی بھی بہن سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی شرعاً نہیں ہو سکتی، البتہ محمد توقیر کی شادی برکت اللہ کی کسی بھی بہن سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو سکتی ہے، جائز ہے: "وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم"(۵)۔

"وتحل أخت أخيه رضاعاً كما تحل نسبا مثل الأخ لأب إذا كانت له أخت من أمه يحل لأخيه من أبيه أن يتزوجها كذا في الكافي"(۶)۔

---

(۱) سورۂ نساء، ۲۳۔

(۲) الصحیح للبخاری ۶/ ۱۲۴، باب ۲۰ طبع استنبول، الصحیح لمسلم ۲/ ۱۰۶۸ طبع استنبول۔

(۳) الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۳۴۳۔

(۴) بدائع الصنائع ۴/ ۳۔

(۵) سورۂ نساء، ۲۴۔

(۶) الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۳۴۳۔

اور بدائع الصنائع میں ہے: "ويجوز للرجل أن يتزوج أخت أخته من الرضاع وهذا ظاهر"(۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت حمل میں نکاح کرنے کا حکم

۱- کیا ایام حمل میں عورت سے نکاح جائز ہے؟

۲- حامدہ سے حالت حمل میں محمود نے نکاح کیا، چار پانچ ماہ کے بعد بچہ تولد ہوا تو کیا اسے پھر نکاح کرنا ہوگا، نکاح کی پھر کیا صورت ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- اگر حمل زنا سے ہو تو اس حمل کی حالت میں نکاح جائز ہوگا، لیکن جس کا حمل ہے اگر اس سے نکاح ہو تو وہ قربت بھی کر سکتا ہے اور دوسرے سے ہو تو وہ تا وضع حمل عورت سے قربت نہیں کر سکتا(۲)۔

۲- سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حامدہ کو حمل محمود ہی سے تھا، اگرچہ یہ حمل حمل زنا تھا، پھر حالت حمل میں نکاح ہوا تو یہ نکاح درست ہوا تجدید نکاح کی ضرورت نہیں (۳)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تنہائی میں نکاح نامہ پر دستخط کرانے سے نکاح ہو جائے گا؟

زید نے ایک لڑکی سے تنہائی میں ایک نکاح نامہ پر دستخط کرایا، اس موقع پر زید اور لڑکی کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا، بعد میں زید نے کسی مجلس میں

---

(۱) بدائع الصنائع للکاسانی ۴/ ۶۔

(۲) "صح نكاح (حبلى من زنا لا) حبلى (من غيره) ــــ (وإن حرم وطؤها) ودواعيه (حتى تضع) ــــ ولو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقاً والولد له" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۴۸، ۴۹ طبع پاکستان)۔

(۳) سابقہ حوالہ۔

گواہوں کی موجودگی میں قاضی سے نکاح پڑھوایا، کیا یہ نکاح منعقد ہوگیا؟ لڑکی اپنے بیان میں والدین سے کہتی ہے کہ میں نے لڑکے کے دباؤ میں آکر یہ سوچ کر دستخط کیا تھا کہ اس طرح تو نکاح ہوتا ہی نہیں ہے، لیکن لڑکی اب زید سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

سوال واضح نہیں ہے، اگر نکاح نامہ پر دستخط کی صورت یہ ہو کہ نکاح نامہ میں ایجاب اور قبول ہو تو بھی اس نکاح نامہ پر دستخط سے نکاح نہیں ہوگا، اس لئے کہ کوئی گواہ موجود نہیں ہے، بعد میں قاضی سے خطبہ پڑھوا کر اگر لڑکے نے نکاح قبول کیا درانحالیکہ وہاں وہ لڑکی موجود نہیں تھی، نہ اس کا کوئی ولی تھا، نہ اس کا کوئی وکیل، تو ایسی صورت میں قاضی نکاح جس نے ایجاب کرایا وہ محض فضولی تھا اور فضولی کا ایجاب معتبر نہیں، جب تک خود لڑکی اس کو منظور نہ کرلے (۱)، ان حالات میں مناسب یہ ہے کہ ایک درخواست قاضی شریعت دار القضاء جنوبی دہلی (یا اپنے علاقہ کے دار القضاء) کے پاس دی جائے اور دونوں فریق حاضر ہو کر اپنی اپنی پوری بات کہیں اور ان سب کو سامنے رکھ کر قاضی شریعت جو حکم شرعی دیں اس پر فریقین عمل کریں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مطلقہ بائنہ عدت گذرنے کے بعد نکاح کرے گی یا عدت کے اندر؟

مطلقہ بائنہ سابق شوہر سے عدت کے اندر نکاح کرے یا انقضاء عدت کے بعد کرے اور اس کی عدت کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

مطلقہ بائنہ (جو تین طلاق سے بائنہ نہ ہوئی ہو) عدت کے اندر اور عدت کے بعد بھی طلاق

---

(۱) "وقال في البحر: الفضولي من يتصرف لغير بغير ولاية ولا وكالة ... فإنه يتوقف على اجازة الزوج" (ردالمحتار ۳/۹۷ طبع پاکستان) اور مزید تفصیل ردالمحتار باب بیع الفضولی میں ہے۔

دینے والے شوہر سے نکاح ثانی کرسکتی ہے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوتیلے ماموں سے نکاح جائز ہے

سوال یہ ہے کہ زید کی دو شادی ہوئی محل ثانی سے ایک لڑکی ہے جو قابل شادی ہے، دوسری طرف ایک لڑکا ہے جو زید کے محل اولی مرحومہ کا سوتیلا بھائی ہے، یعنی لڑکا رشتہ میں ماموں ہوتا ہے، مگر در اصل سوتیلی ماں کا سوتیلا بھائی ہے، اب ایسی حالت میں ان دونوں میں شادی کا رشتہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ زید کی پہلی بیوی مرگئی اور دوسری شادی کیا جس سے یہ لڑکی ہے، ادھر زید کی اپنی ساس کے انتقال کے بعد ان کے سسر نے دوسری شادی کرلیا جس سے وہ لڑکا ہے۔ شرع کے مطابق جو حکم ہو مطلع فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں نکاح جائز ہے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) "إذا كان الطلاق بائناً دون الثلاث، فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضاءها" (الہدایہ ۳/۲۶۶ طبع پاکستان)۔

(نوٹ) طلاق دینے والے شوہر سے نکاح ثانی کرنے کی صورت میں تو عدت گذارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چاہے تو عدت کے اندر نکاح جدید کرے یا عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی کرسکتا ہے، البتہ اگر کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا ہو تو عدت پوری گذارنے کے بعد ہی نکاح کرسکتی ہے، عدت حیض والی عورت کے لئے تین حیض، حاملہ کے لئے وضع حمل اور جس کا حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا ہو یا جس کا حیض آنا بوڑھی ہونے کی وجہ سے بند ہوگیا ہو اس کے لئے تین ماہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" (سورۂ بقرہ/۲۲۸)، اور: "وأولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن" (سورۂ طلاق/۴)، اور: "واللائي يئسن من المحيض من نسائكم" ...... "فعدتهن ثلاثة أشهر" (سورۂ طلاق/۴)۔

(۲) اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان حرمت کا رشتہ نہیں ہے جو آپس میں نکاح کے لئے مانع ہو۔

مطلقہ عورت سے نکاح

زید نے ایک مطلقہ عورت سے ناجائز تعلق کر کے تقریباً آٹھ سال سے تین بچے پیدا کئے، جب سے یہ تعلق پیدا ہوا اس وقت سے اب تک خورش و پوشش کا کل اخراجات زید ہی کر رہا ہے، ان کے اور ان کے بچوں کے کھانے پینے کا زید کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اب زید اس سے چھٹکارا چاہتے ہیں، شرعاً زید کو اس سے نجات پانے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق

زید اب تک تو بدترین گناہ کرتا ہی رہا، اب دوسرا اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ کرنا چاہتا ہے، یعنی اس عورت کو اور ان بچوں کو جسے زید نے پیدا کیا ہے، بے سہارا اور محتاج چھوڑ دینا چاہتا ہے، یہ دونوں باتیں بہت بُری ہیں، زید کو چاہئے کہ فوراً اس عورت سے نکاح کر لے اور سب کی کفالت کرتا رہے اور اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کرے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المہر

مہر روپئے کی شکل میں رکھنا بہتر ہے یا سونے چاندی کی شکل میں

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں:

مہر، سکۂ رائج الوقت یعنی روپے میں رکھنا بہتر اور مناسب ہے، یا سونے، چاندی یا زیورات کی شکل میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے، فوری ادا کرنا اچھا ہے، یا تاخیر سے؟ وضاحت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

بہتر یہی ہے کہ سونے یا چاندی میں مہر مقرر کیا جائے، اس میں لڑکی کا فائدہ اور اس کے حق کی حفاظت ہے (۱)۔

مہر نقد ادا کر دینا ہی بہتر ہے، اگر نکاح کے وقت نہ دے تو رخصتی کے بعد جلد سے جلد ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر کی ادائیگی کا وقت

بیوی کا مہر کس وقت دینا چاہئے، کاغذات صحیح طور پر لکھنا چاہئے یا غلط لکھا گیا تو اسے مان لینا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق

مہر شریعت کا مقررہ کردہ ایک فریضہ ہے، اس لئے مہر کی ادائیگی نکاح کے بعد بیوی سے

---

(۱) سونے چاندی میں مہر کی ادائیگی اس لئے بہتر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عام طور پر درہم و دینار کے ذریعہ مہر مقرر فرمایا، درہم سونے کا ہوا کرتا ہے اور دینار چاندی کا، اور اس میں عورت کے حق کی حفاظت اس لئے ہے کہ سونے چاندی کی قیمت میں استحکام ہوتا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی قدر بھی بڑھتی جاتی ہے اور کاغذی نوٹ اور سکوں کی قیمت میں استحکام نہیں ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی قدر بھی گھٹتی جاتی ہے۔

(۲) مہر چونکہ دوسرے دیون کی طرح ایک دین ہے اور دین کے سلسلہ میں اصول یہی ہے کہ اسے جلد سے جلد ادا کر دینا اور اس کی ذمہ داری سے برأت حاصل کر لینا چاہیے۔

ملنے سے پہلے ہونی چاہئے، البتہ بعد میں بھی ادا کیا جائے تو ادا ہو جائے گا، مہر طے کرتے وقت جتنا مہر طے ہوا تھا اور جس طرح ہوا تھا اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً، فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا"(۱)۔

"فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ"(۲)۔

"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً"(۳)۔

فریقین کو اپنے معاہدے پر قائم رہنا لازم ہے، اور اس سے انحراف شرعاً حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا"(۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی کو دیا ہوا مال اس کی ملکیت ہے

میں نے لڑکی کو پونے چار تولے سونے کے زیور اور دس تولے چاندی چڑھائی تھی، لیکن جب بہو اور میری لڑکیوں میں ان بن ہوگئی تو میں دوسری جگہ جہاں کہ میری زمین ہے اس پر لڑکے اور بہو کے لئے کمرہ بنانا شروع کر دیا۔ جب پیسے کی کمی پڑی تو میں نے لڑکی کو چڑھائے زیور بیچ کر مکان مکمل کرایا اور ان دونوں کو علاحدہ کر دیا، مجھے بتایا جائے کہ کیا ہم نے جو زیور لڑکی شیبا کو چڑھائے تھے اس پر طلاق ہو جانے کے بعد شیبا تبسم (بہو) کا حق ہے، یا وہ زیور ہمارے ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

جو زیورات لڑکے والوں کی طرف سے بہو کو دئے گئے اس کی ملکیت ہیں، وہ زیورات یا ان کی مالیت بہو کو ادا کرنا ضروری ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) سورۂ نساء ر ۴ (اور تم بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ دیدیا کرو، لیکن اگر وہ خوشدلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جز چھوڑ دیں تو تم اسے مزہ دار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ)۔

(۲) سورۂ نساء ر ۲۵ (سو ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لیا کرو اور ان کے مہر ان کو دیدیا کرو مقرر کے موافق)۔

(۳) سورۂ نساء ر ۲۴ (پھر جس طریقہ سے تم نے ان عورتوں سے لذت لی ہے، سو انھیں ان کے مقرر شدہ مہر دیدو)۔

(۴) سورۂ اسراء ر ۳۴ (اور عہد کی پابندی رکھو، بیشک عہد کی باز پرس ہوگی)۔

باب النسب

ولد الزنا ثابت النسب ہے یا نہیں؟

زنا کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوگی اس کا نسب کس سے ثابت ہوگا، نیز اس کی کفالت کس کے ذمہ ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق

بے شعوری یا نقص عقل ان معاملات میں عذر نہیں، اگر وہ لڑکی شادی شدہ ہے تو اس کا بچہ اس کے شوہر کی طرف منسوب ہوگا "الولد للفراش وللعاهر الحجر"(۱)۔

اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا اور ماں پر اس کی پرورش واجب ہوگی اور اگر کوئی صورت نہیں تو جماعت مسلمین پر اس بچہ کی کفالت ضروری ہوگی، ارشاد رسول ﷺ ہے: "أنا ولي من لا ولي له"(۲)۔

---

(۱) سنن أبي داود کتاب الطلاق ۲ / ۷۰۵ طبع استنبول۔

(۲) مسند احمد ۴ / ۱۳۳ طبع استنبول۔

باب الولایة

ماں بچوں کی ولی ہوسکتی ہے

ہمارے والد بزرگوار ویسٹ بنگال گورنمنٹ کے کسی پوسٹ پر کام کرتے تھے، ان کے کچھ روپے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور صحیح معنوں میں وہ روپیہ ہم لوگوں کو ملنا چاہئے، افسروں کا کہنا ہے کہ اسلامی قاعدہ سے یہ روپیہ تمہاری ماں کو دیا جاسکتا ہے، یا نہیں، ہم دو بھائی نابالغ اور ایک بہن نابالغ ہیں، فی الحال ہم اپنی ماں کی گود میں پرورش پارہے ہیں، اس وقت تو میری ماں گویا باپ کا حق ادا کررہی ہیں۔ امید ہے کہ آپ حضور نیک مشورہ سے ضرور ہدایت کریں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق

جب آپ لوگوں کی والدہ ہی آپ لوگوں کی سرپرستی اور تولیت کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ ماں جیسی شفقت کسی اور سے متوقع نہیں، ایسی صورت میں ماں بچوں کی ولی ہوکر ان کے مال پر قبضہ کرسکتی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الطلاق

طلاق دینے کا شرعی طریقہ

شریعت میں طلاق کس طرح دی جاتی ہے اور کس طرح دینا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق

طلاق کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری ختم ہوجائے اور وہ پاک ہوجائے اور شوہر نے اس کے ساتھ صحبت نہیں کی ہو تو اس حالت میں اگر مجبوری ہو یعنی نباہ نہیں ہو پارہا ہو تو ایک بار طلاق دی جائے اور بس۔ اس کے بعد اگر نباہ کی صورت نکل آئے تو سبحان اللہ، عدت کے اندر اندر لوٹالے اور نباہ کی صورت نہیں تو خاموش رہے، عدت گذارنے کے بعد عورت بائن ہوجائے گی، یہ سب سے بہتر صورت ہے، پھر اگر ضرورت ہو تو دوسرے اور تیسرے مہینہ میں پاکی کی حالت میں ایک ایک طلاق دی جاسکتی ہے، تین طلاقیں بیک وقت دینا گناہ کی بات ہے، البتہ دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے: "(فالأحسن أن يطلق الرجل امرأته تطليقة واحدة في طهر لم يجامعها فيه ويتركها حتى تنقضي عدتها) لأن الصحابة رضي الله عنهم كانوا يستحبون أن لا يزيدوا في الطلاق على واحدة حتى تنقضي العدة، فإن هذا أفضل عندهم من أن يطلقها الرجل ثلاثاً عند كل طهر واحدة ولأنه أبعد من الندامة وأقل ضررا بالمرأة... حيث أبقى لنفسه مكنة للتدارك حيث يمكنه التزوج بها في العدة أو بعدها دون تخلل زوج آخر"(۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) الہدایہ مع فتح القدیر ۳/۷ ۴۴ طبع بیروت۔

طلاق کے لئے کنائی الفاظ کے استعمال میں نیت کا اعتبار

طلاق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ شوہر نے بیوی کو مندرجہ ذیل خط لکھا، اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

(خط کا ایک حصہ) تم اپنے کو کیا سمجھتی ہو، گھر میں آدمی کی ضرورت ہے، آدمی بیمار ہے، تم اپنے بھائی سے ملاقات کرنے یا رخصت کرنے میں اگر تین دن لگاؤ گی تو ہم کو ایسے آدمی کو گھر میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم آزاد ہو جہاں چاہو، چلی جاؤ، تمہارا کوئی مالک نہیں ہے، تم کو ہمارے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، تم کو ایک بار نہیں ہزار بار تاکید کردیا، اب صرف آخری فیصلہ باقی رہ گیا ہے اگر تم باز نہیں آئی تو وہ بھی وقت آجائے گا، اگر تم وہی چاہتی ہو تو ہم بھی تیار ہیں، اگر تم کو ہمارے حکم کے مطابق چلنا ہے تو انسان کے بچہ کی طرح رہوگی، ورنہ اپنا راستہ دیکھو، اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوا، یا ہم کو گھر کے خط سے پتہ چلا کہ کچھ بھی ڈرامہ ہوا ہے، تو تم جانو اور تمہارا کام جانے۔

الجواب وباللہ التوفیق

سوال میں مذکور شوہر کے خط کے ابتدائی حصہ میں جو الفاظ مشروط استعمال کئے گئے ہیں، وہ کنایات میں سے ہیں جو عام طور پر محتاج نیت ہوتے ہیں، یا کبھی دلالت حال سے ہی اس کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔

دلالت حال میں دلالت قولی اور دلالت عملی دونوں شامل ہیں، اس میں غضب اور مذاکرہ بھی داخل ہوتا ہے، خط میں ناراضی کا اظہار ضرور ہے، لیکن کاتب نے خط غصہ کی حالت میں لکھا تھا کہنا مشکل ہے، مذاکرہ موجود نہیں ہے، مذاکرہ میں مطالبۂ طلاق یا تقدیم طلاق ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں ہے اور خارجی احوال سے پہلے حکم کی تعیین میں کسی تحریر یا قول کے سیاق وسباق کی دلالت

زیادہ اہم اور واضح حیثیت رکھتی ہے، خط مذکور میں شوہر کے یہ جملے "تم کو ایک بار نہیں ہزار بار تاکید کردیا، اب صرف آخری فیصلہ باقی رہ گیا ہے، اگر تم باز نہیں آئی تو وہ وقت بھی آجائے گا، اگر تم وہی چاہتی ہو تو ہم بھی تیار ہیں ...... اگر تم کو ہمارے حکم کے مطابق چلنا ہے تو انسان کے بچہ کی طرح رہوگی"، وغیرہ صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ کاتب کے پہلے جملوں سے نیت، طلاق کی نہیں، بلکہ آئندہ حالت نہیں سدھارنے کی صورت میں طلاق کی دھمکی دینا مقصود ہے، ایسی صورت میں شوہر کا یہ کہنا کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، ظاہر حال اس کی تائید وتصدیق کرتا ہے، اور معلوم ہے کہ خلاف ظاہر کا اثبات محتاج بینہ ہے اور نیت ظاہر حال کے لئے مثبت ہے۔

فالكنايات (لا تطلق بها) قضاء (إلا بنية أو دلالة الحال) در مختار، (قوله: قضاء) قيد به لأنه لا يقع ديانة بدون النية ولو وجدت دلالة الحال فوقوعه بواحد من النية أو دلالة الحال، إنما هو في القضاء فقط كما هو صريح، البحر وغيره۔

(قوله: أو دلالة الحال) المراد بها الحالة الظاهرة المفيدة لمقصوده ومنها تقدم ذكر الطلاق، بحر عن المحيط ...... فتفسر المذاكرة بسؤال الطلاق أو تقديم الإيقاع كما في اعتدّى ثلاثاً (۱)۔

پس مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں سوال میں مذکور خط کے جملوں سے طلاق اسی صورت میں واقع ہوگی جب کہ کاتب تحریر نے طلاق کی نیت بھی کی ہو، اگر شوہر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ جملے لکھتے وقت طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو اس سے حلف لے لیا جائے، اگر وہ حلفاً طلاق کی نیت سے انکار کردے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی بیوی حسب سابق اس کی بیوی رہے گی، والقول له بيمينه في عدم النية (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا بحالت غضب "جواب دیا" سے طلاق واقع ہوجائے گی؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل کے سلسلہ میں:

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۹۶، ۲۹۷ طبع پاکستان۔
(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۳/۳۰۰، ۳۰۱ طبع پاکستان۔

زید نے اپنی بیوی ہندہ کو آپسی حجت وتکرار کے دوران سب وشتم نیز معمولی زد وکوب کے بعد یوں کہا کہ جاؤ میں نے تم کو جواب دیا، جواب دیا، جواب دیا، یعنی تین بار۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے بحالت غضب یہ بات کہی ہے، حالانکہ علاحدگی اور جدائی کی کوئی نیت نہیں تھی اور نہ ہے اور یہ واقعہ کل بروز پیر کا ہے۔

جب کہ یوپی اور بہار میں خاص طور سے طلاق کے ساتھ لفظ جواب عطف تفسیر کے طور پر استعمال کرنے کا عام رواج ہے، (کہا جاتا ہے فلانی کا جواب ہوگیا، یعنی طلاق ہوگئی)۔

الغرض زید اپنی جملہ حرکتوں پر نادم ہے اور دوبارہ ہندہ کو اپنی زوجیت میں لینا چاہتا ہے، اس کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفيق

لفظ "جواب دیا" ان الفاظ کنائی میں سے ہے جس کا استعمال طلاق میں متعارف ہے، اس لئے صورت مذکورہ میں نیت کے استفسار کی حاجت نہیں ہے اور زید کی بیوی پر طلاق بائن واقع ہوچکی ہے اور چونکہ "جواب دیا" صریح نہیں، الفاظ کنائی میں سے ہے، اس لئے فقہاء کے بیان کردہ قاعدہ: "البائن لا يلحق البائن" کے مطابق زید کی بیوی پر صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی ہے، زید اور اس کی بیوی دونوں راضی ہیں تو دوبارہ نکاح کرکے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

"والحاصل أن المعتبر في انصراف هذه الألفاظ عربية أو فارسية إلى معنى بلا نية التعارف فيه، فإن لم يتعارف سئل عن نيته وفيما ينصرف بلا نية لو قال أردت غيره يصدق ديانة لا قضاء الخ، ما في الفتح، وتبعه في البحر، قلت والمتعارف في ديارنا إرادة الطلاق بقولهم عليّ الحرام لا أفعل كذا دون غيره من الألفاظ المذكورة"(۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) ردالمحتار، باب الایلاء، ۳/۴۳۵ طبع پاکستان۔

"البائن لا يلحق البائن" سے مراد؟

درمختار کی عبارت "البائن لا يلحق البائن" کی مکمل وضاحت فرمائیں اور یہ کہنے سے کہ میں نے تجھے تین طلاق بائن دے دی، کتنی طلاقیں واقع ہوں گی اور کون سی واقع ہوں گی؟

الجواب وباللہ التوفيق

اگر پہلے طلاق بائن واقع ہوچکی ہے خواہ لفظ صریح یا لفظ کنائی سے تو دوبارہ طلاق بائن لفظ کنائی سے واقع نہیں ہوگی، یہ ہے مطلب فقہاء کے قول "البائن لا يلحق البائن" کا، الا یہ کہ صراحت کردے کہ میں دوسری طلاق بائن واقع کررہا ہوں تو لفظ کنایہ سے دوسری طلاق بائن بھی واقع ہوجائے گی، اور اگر کسی نے کہا "میں نے تجھے تین طلاق دی" تو اس سے تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی اور عورت حرام ہوجائے گی، کحرمة غليظة۔

(لا) يلحق البائن (البائن) إذا أمكن جعله إخبارا عن الأول كانت بائن بائن أو أبنتک بأخرى (قوله لا يلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذي لا يلحق هو ما كان بلفظ الكناية لأنه هو الذي ليس ظاهرًا في إنشاء الطلاق كذا في الفتح وقيد بقوله الذي لا يلحق إشارة إلى أن البائن الموقع أولاً أعم من كونه بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح المفيد للبينونة كالطلاق على مال(۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق کی قسم کا کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں:

مدعی بینہ پیش کرنے سے قاصر ہے تو کیا مدعا علیہ سے طلاق کی قسم لی جاسکتی ہے؟ طلاق کی قسم کا کیا حکم ہے؟ خصوصاً طلاق "مغلظہ" یا "کلما" کی قسم کا مطالبہ کیسا

(۱) الدرالمختار مع ردالمحتار، باب الکنایات ۳/۳۰۸ طبع پاکستان۔

ہے؟ نیز قسم کے لئے مدعی کا مطالبہ ضروری ہے یا قاضی از خود بغیر مطالبہ کے قسم لے گا؟ کتب قضاء وفتاویٰ کے حوالے بھی تحریر فرمائیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق

کسی بھی خصومت میں مدعی کے پاس بینہ موجود نہیں ہونے کی صورت میں مدعاعلیہ سے حلف لیا جاتا ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے: "البینة علی المدعي والیمین علی المدعی علیه" (۱)، یہ حلف اللہ کے نام کا ہونا چاہئے۔ اور بس، تغلیظ کے لئے صفات الٰہی کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، طلاق یا عتاق کی قسم لینا حرام اور ممنوع ہے، لہٰذا اگرچہ مدعی اصرار کرے طلاق کی قسم نہیں لی جاسکتی۔

درمختار میں ہے: "(والیمین باللہ تعالی) لحدیث "من کان حالفاً فلیحلف باللہ تعالیٰ أو لیذر (۲) ...... (لا بطلاق وعتاق) وإن ألحّ الخصم، وعلیه الفتوی، تاتارخانیة، "لأن التحلیف بهما حرام" خانیة (۳)۔

اگر مدعاعلیہ پر طلاق کی قسم پیش کی جائے اور وہ انکار کردے تو اس کا یہ انکار "نکول عن الحلف" قرار نہیں پائے گا اور نہ اس انکار سے مدعی کا دعویٰ ثابت تسلیم کیا جائے گا، جیسا کہ حلف باللہ کی صورت میں نکول عن الحلف، اقرار دعویٰ کے حکم میں ہوکر موجب ثبوت دعویٰ ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جو قول بعض کتب میں مذکور ہے، اسے صاحب بحر نے ضعیف قرار دیا ہے، قاضی خاں نے اس کی صراحت کی ہے کہ "اگر مدعی طلاق یا عتاق کے حلف کا مطالبہ کرے تو قاضی اس کے اس مطالبہ کو قبول نہیں کرے گا، اس لئے کہ طلاق وعتاق کی قسم لینا حرام ہے" (۴) اور تاتارخانیہ نے اس قول کے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأحکام ۳/ ۶۲۶، حدیث: ۱۳۴۱، صحیح البخاری، کتاب الرہن۔
(۲) صحیح البخاری، کتاب مناقب الأنصار ۴/ ۲۳۴ طبع استنبول۔
(۳) الدر المختار علی رد المحتار، کتاب الدعوی ۸/ ۳۰۲ طبع بیروت۔
(۴) وفي الخانية: "وإن أراد المدعی تحليفه بالطلاق والعتاق في ظاهر الرواية لا يجيبه القاضي إلى ذلک لأن التحليف بالطلاق والعتاق حرام" (البحر الرائق ۷/ ۲۱۳ طبع بیروت)۔

مفتی بہ ہونے کی تصریح کی ہے: "والفتوی علی عدم التحلیف بالطلاق والعتاق" (۱)۔

اصل یہ ہے کہ مدعاعلیہ سے حلف مدعی کے مطالبہ کے بعد ہی لیا جائے، بعض صورتوں میں امام ابویوسف سے اس کے خلاف منقول ہے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں:

میمونہ خاتون کو اس کے شوہر سلیمان نے بارہ بجے رات میں زدوکوب کرکے کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دے دی، طلاق دے دی، متعدد بار، اس لفظ کو دہرایا اور کہا کہ تو یہاں سے نکل جا، شور وغل سن کر میمونہ کی چچی خوش دامن آئیں اور سلیمان کو ڈانٹ کر بولی کہ تم نے کیوں طلاق دی اور میمونہ کو اپنے گھر لے گئیں اور سلیمان کا چچا اور اس کی بہن نے بھی طلاق دیتے ہوئے سنی، یہ بیان میمونہ کا ہے۔

لیکن میمونہ کے شوہر سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے اور طلاق دینے سے انکار کیا اور تین گواہوں میں سے صرف میمونہ کی چچی خوش دامن نے جو سلیمان کی چچی ہوتی ہیں طلاق کی گواہی دی کہ اس نے سلیمان سے سنا ہے، لہٰذا دریافت یہ ہے کہ یہ طلاق ازروئے شریعت ہوئی یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

سوال مذکور سے پتہ چلتا ہے کہ شوہر نے "میں نے تجھ کو طلاق دے دی" کا جملہ دوبارہ سے زیادہ کہا ہے، ایسی صورت میں اس کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی، بدون حلالہ وہ عورت شوہر کے لئے حلال نہیں، قرآن کریم میں ہے: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ

(۱) البحر الرائق ۷/ ۲۱۳ طبع بیروت، الدر المختار علی رد المحتار ۸/ ۳۰۲ طبع بیروت۔
(۲) معین الحکام/ ۶۸۔

زَوْجًا غَیْرَهٗ" (۱)۔

سوال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر کو اب طلاق سے انکار ہے، نیز گواہوں کے بیانات بھی مختلف ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ سلیمان، اس کی بیوی، سلیمان کا چچا، اس کی بہن اور میمونہ کی چچی خوش دامن یہ سب لوگ قاضی شریعت دار القضاء پھلواری شریف کے پاس حاضر ہوں، شہادتیں لے کر، پھر حسب ضابطۂ شرع سلیمان سے حلف لے کر جو فیصلہ قاضی شریعت کردیں، اس پر عمل کریں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عدد ذکر کئے بغیر دی ہوئی طلاق کا حکم

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین مسئلہ ذیل میں:

زید نے اپنی منکوحہ فاطمہ کو طلاق دی، مگر اس نے عدد طلاق بیان نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دی" فاطمہ دوسرے روز اپنے میکہ چلی آئی، اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوگیا، اب زید اپنے کئے پر نادم ہے اور وہ فاطمہ کو اپنی زوجیت میں رکھنا چاہتا ہے، صورت مذکورہ میں زید کا ایسا کرنا درست ہوگا؟ کیا تجدید نکاح کے ذریعہ فاطمہ زید کی زوجیت میں دوبارہ جا سکتی ہے؟ براہ کرم جواب صواب سے نواز کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر زید نے صرف یہ جملہ "میں نے تم کو طلاق دی" کہا ہے اور عدد طلاق بیان نہیں کیا تو اس کی بیوی فاطمہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، "والطلاق يقع بعدد قرن به لا به نفسه عند ذكر العدد وعند عدمه الوقوع بالصيغة" (۲)۔

زید کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کو عدت کے اندر اندر لوٹا لے، عدت ختم ہوجانے کے

(۱) سورۂ بقرہ/ ۲۳۰۔

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۵۱۳، ۵۱۴ طبع بیروت۔

بعد بغیر دوبارہ نکاح کے رکھنا درست نہیں، لوٹانے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو آدمیوں کو گواہ بنا کر یہ کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو لوٹا لیا (۱)۔

عام عورتوں کی عادت یہ ہے کہ عدت "تین حیض" تین مہینے میں گذر جاتی ہے، اگر اس عورت کی بھی عدت گذر چکی ہے تو دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کا حکم

گذارش ہے کہ فدوی مدرسہ اصلاح المسلمین پتھر کی مسجد پٹنہ میں باورچی کا کام کرتے تھے، میری بیوی کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی اور ماری ماری پھرتی تھی، کلام صاحب نے ہم کو بلا کر یہ سب بات کہا تو ہم شرمندہ ہوگئے، ہم نے کلام میاں سے کہا: آپ کو ایسی حرکت ہم سے نہیں کہنا چاہئے تھا، اس پر اس نے ڈانٹ کر کہا کہ ہم کیا کریں تم اس کو مار کر پھینک دو، ہم نے کہا کہ ہم نے بہت اصلاح کیا، آئندہ اس کو ہم الگ کردیں گے۔ ایک روز ہم نے اپنا سامان دوسری جگہ لے جانا چاہا اور ہم کہتے ہیں کہ تم اس کو طلاق ابھی دے دو، کلام صاحب کی بیوی اور ان کی خوش دامن اور خود انہوں نے ہم کو اپنے گھر میں بلایا اور زبردستی یہ کہہ کر کہ ہم اس کی دوسری شادی کردیں گے، تم اس وقت ہم تینوں کے سامنے طلاق دے دو، مجبوراً ہم کو طلاق دے دینا پڑا، اور سات آٹھ ماہ کا حمل ہے، ولادت عنقریب ہے، ایسی حالت میں جب کہ ہم نے تین طلاق دے دیا اور یہ حاملہ بھی ہے، یہ میری زوجیت میں رہی کہ نہیں؟ اس کو حضور بتا دیں۔

(۱) قرآن کریم میں ہے: "وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ" (سورۂ طلاق/ ۲) اور رد المحتار میں ہے: "(وندب الإشهاد) بعدلين ... وأن الرجعة على ضربين: سني، وبدعي، فالسني أن يراجعها بالقول ويشهد على رجعتها ويعلمها" (الدر المختار مع رد المحتار ۵/ ۲۸)۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر واقعی آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی ہے تو آپ کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور وہ عورت آپ کے لئے حرام ہوچکی ہے۔ بغیر حلالہ کے دوبارہ اس سے نکاح درست نہیں (۱) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت نشہ میں تحریری طلاق کا حکم

جنید عالم نے اپنی اہلیہ کو خانگی اختلافات کی بنیاد پر میکہ پہنچادیا اور خود کلکتہ روانہ ہوگئے، وہاں انہوں نے چند دوستوں کی ضد پر تاڑی پی لی، نشہ کی کیفیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ این وآں سے یکسر بے نیاز ہوگئے، بعد ازاں ان کے دوستوں نے ان کو قیام گاہ پر پہنچادیا۔ نشہ کی اس کیفیت میں ذہن سے خانگی زندگی محو ہونے کی بجائے ذہن کے پردے پر نمایاں ہونے لگی جس کی تاب وہ نہ لاسکے اور اسی آشفتہ سری اور ذہنی انتشار کے عالم میں انہوں نے ایک خط تحریر کیا جس میں تین مرتبہ یہ جملہ لکھا ”جنید عالم نے سہیلہ خاتون کو طلاق دیا“ (سہیلہ خاتون جو جنید عالم کی اہلیہ ہیں) اس جملہ سے پہلے یا بعد، کیا کچھ لکھا انہیں قطعاً یاد نہیں۔ یہ خط انہوں نے اپنے ایک دوست کی مدد سے سپرد ڈاک کیا۔ خط موصول ہونے پر ان کی اہلیہ نے بے ساختہ کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، وہ ہرگز نہیں کرسکتے، یقیناً وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں، ان کی اہلیہ نے اپنے والد پر زور دیا کہ مجھے میرے سسرال پہنچادو، لیکن اس کے والد صاحب اس کے لئے

(۱) ”فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ“ (سورۂ بقرہ/ ۲۳۰)۔
نیز حالت حمل میں طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل ہے: ”(و) في حق (الحامل) مطلقا ولو أمة أو كتابية أو من زنا بأن تزوج حبلى من زنا ودخل بها ثم مات أو طلقها تعتد بالوضع“ (الدر المختار علی رد المحتار ۵/ ۱۸۹، ۱۹۰ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

آمادہ نہ ہوئے۔

یہ خط آج سے تقریباً تین ماہ قبل اپنے خسر صاحب کے نام انہوں نے روانہ کیا تھا جب کہ ان کی اہلیہ تین ماہ کی حاملہ تھیں، معاملے کی نوعیت کے پیش نظر از روئے شریعت طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر جنید عالم نے اپنے خسر کو یہ جملہ ”جنید عالم نے سہیلہ خاتون کو طلاق دیا“ تین مرتبہ لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیجا (خواہ نشہ ہی کی حالت میں لکھا ہو) تو اس کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور وہ عورت اب اپنے شوہر کے لئے بالکل حرام ہوچکی (۱)۔ واضح ہو کہ طلاق نشہ کی حالت میں بھی واقع ہوجاتی ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، البحر الرائق میں ہے: ”وفي الخانية من كتاب الخلع سائر تصرفات السكران جائزة الخ“ (۲)۔

حاملہ عورت کو طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا طلاق سکران کا وقوع اجماعی ہے؟

محترم المقام حضرت اقدس قاضی صاحب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ!

ابھی حال ہی میں ایک نومولود رسالہ ”ترجمان دیوبند“ میں فقہی سیمینار کے عنوان پر ایک طویل مضمون خود راقم کی اور بہت سے احباب کی نظروں سے گذرا۔ ایک سیمینار کے موقع پر ”نشہ آور کی طلاق“ کی بحث میں حضرات مفتیان کرام کے متضاد بیانات بھی باعث تشویش ہیں، راقم چونکہ عنادل قاسمیہ سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے بلا جھجک حضرت والا سے ہی رابطہ قائم کرکے اجماعی مسئلہ کا خواہاں ہے۔

راقم اب تک تو یہی پڑھتا، دیکھتا وسنتا اور سناتا چلا آیا ہے کہ ”نشہ آور کی طلاق“

(۱) ”فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ“ (سورۂ بقرہ/ ۲۳۰)۔
(۲) البحر الرائق ۳/ ۲۶۶۔

کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں اور اس پر قدماء ومتاخرین فقہاء امت کا اجماع ہے، لیکن حضرت والا اور چوبیس مفتیان کرام کی رائے دیکھ، پڑھ کر کہ "طلاق واقع نہیں ہوگی" خلاف اجماع کا ارتکاب کرنا لازم آرہا ہے، جس کی وجہ سے راقم کو سخت تشویش ہے۔ اس لئے حضرت والا کی نظر دقیق واقعی اگر صحت پر قائم ہے تو دلیل سے آگاہ فرمائیں۔ صحیح کیا ہے، مدلل، مبرہن اور منقح فرمائیں، تاکہ باہمی چہ میگوئیاں ختم ہوں، "بحث ونظر" کا رسالہ بھی عنوان ذیل سے حکم اجراء فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

محترمی!

سلام مسنون

آپ کا خط پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے براہ راست مجھ سے پوچھ لیا، محض کہنے سننے پر رائے قائم نہیں کی۔

آپ کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ "طلاق سکران" کا وقوع اجماعی قول ہے، اس کے خلاف کوئی رائے دینا خرق اجماع ہے، اصل سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ "مجمع علیہ" ہے، یا "مجتہد فیہ"؟ اگر تمام فقہاء کے اقوال کا احصاء کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ "مسئلہ وقوع طلاق سکران" کے مجتہد فیہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، خود ائمہ احناف میں امام طحاوی، امام کرخی اور ابن مسلمہ جیسے جلیل القدر اصحاب کا قول بھی یہی ہے کہ "سکران کی طلاق واقع نہ ہوگی"۔

دیگر ائمہ کے یہاں بھی اس طرح کے اقوال ملتے ہیں، لہذا مسئلہ کے اجماعی ہونے کا دعویٰ اور عدم وقوع طلاق سکران کے قول کو خرق اجماع قرار دینا خطاء فاحش اور قصور مطالعہ کی دلیل ہے۔

سمینار میں جو کچھ فیصلہ کیا گیا وہاں صرف یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ طلاق کی کثرت اور اس کے نتیجہ میں خاندان کی بربادی، بیوی اور بچوں کا مبتلائے مصائب ہونا عظیم فتنہ ہے۔ علی العموم طلاق دینے والا مرد دوسری شادی کرکے آرام سے رہتا ہے، جو کچھ مصیبت جھیلنی پڑتی ہے وہ مطلقہ عورت

کو۔ پھر نشہ کا بھی رواج عام ہے، جس میں آدمی ہوش وحواس کھوکر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، پس امام ابوحنیفہ یا دیگر ائمہ جو وقوع طلاق سکران کے قائل ہیں، ان کے قول اور ان کی دلیلوں سے اختلاف کئے بغیر آج کے زمانہ میں معروف قول سے عدول کرکے، کیا اس قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے اور عمر بن عبدالعزیز، قاسم، طاؤس، ربیعہ، یحییٰ انصاری، امام لیث، عنبری، اسحاق، ابوثور اور امام مزنی کا قول ہے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بروایت صحیحہ ثابت ہے(۱): قال أحمد حديث عثمان أرفع شيء فيه(۲)۔

پس وقوع طلاق کا قول جو اکثر ائمہ اور تابعین یعنی سعید بن المسیب، عطاء، مجاہد، سیرین، شعبی، نخعی، ثوری، اوزاعی اور امام شافعی (ایک قول میں) وغیرہ کا ہے، کیا اس قول کو چھوڑ کر معاشرہ کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے، دوسرے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرات اصحاب افتاء کو ان چند باتوں کو دیکھنا ہے کہ مسئلہ "مجتہد فیہ" ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ واقعی معاشرہ ایسے فتنہ میں مبتلا ہے یا نہیں؟ جس سے بچانے کے لئے مذہب کے معروف قول سے غیر معروف کی طرف عدول کرنا جائز ہو۔ آراء کا اختلاف اسی تجزیہ میں ہوا ہے، کیا واقعۃً صورت حال ایسی سنگین ہے کہ مذہب کے قول معروف کو چھوڑ کر ہم خود مذہب حنفیہ کے دوسرے قول کی طرف رجوع کریں، آپ صرف درمختار کا مطالعہ کریں، جہاں لکھا ہے: "ولم يوقع الشافعي طلاق السكران واختاره الطحاوي والكرخي وكذا محمد بن سلمة وهو قول زفر"(۳)۔

اور تاتارخانیہ میں "تفرید" سے منقول ہے: "والفتوى عليه"(۴)۔ اگرچہ تاتارخانیہ کی

---

(۱) حدثنا سعيد قال: حدثنا أبو معاوية قال: حدثنا ابن أبي ذئب عن الزهري عن أبان بن عثمان عن عثمان رضي الله عنه قال: كل طلاق جائز إلا طلاق النشوان وطلاق المجنون" (سنن سعید بن منصور ۱/۱۷۱۲ طبع بیروت، ابن ابی شیبہ ۱/۷ ۳۳، عمدۃ القاری شرح البخاری ۲۰/۲۵۱ طبع بیروت)۔

(۲) المغنی لابن قدامہ ۷/۱۱۵۔

(۳) الدر المختار علی رد المحتار ۳/۲۴۱ طبع پاکستان۔

(۴) الفتاوی التاتارخانیہ ۳/۲۵۶ طبع پاکستان۔

یہ روایت دیگر متون میں مذکور قول مفتی بہ سے متعارض ہے۔

بہر حال مسئلہ صرف اتنا ہے کہ صورت حال کے اندازہ میں دو شخصوں کی رائے مختلف ہوسکتی ہے، اس کی نظیر ''تحری'' ہے۔ جن علماء نے صورت حال کو اتنا سنگین تصور کیا، انہوں نے عدول کی رائے دی اور جنہوں نے حالات کو اتنا سنگین تصور نہیں کیا، انہوں نے عدول کو صحیح قرار نہیں دیا، یہی خلاصہ ہے اس بحث کا جو سمینار میں ہوئی۔ لیکن جب فقہی احکام اور مسائل کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے اور میدان سیاست کی گیند بنا دیا جائے تو وہی سب کچھ ہوتا ہے جو ہو رہا ہے، جن لوگوں نے کتاب نہیں پڑھی، جن کو یہی پتہ نہیں کہ امام زفر، امام طحاوی، صحابہ میں عثمان غنی اور ائمہ میں امام شافعی (ایک قول کے اعتبار سے) جس بات کے قائل ہوں، اس کو اگر کسی نے بر بنائے دلائل نہیں، بلکہ بر بنائے تغیر حال اور بر بنائے مصالح و مقاصد شرع، اختیار کرلیا تو معاذ اللہ اسے کفر وارتداد تک پہنچانے کے لئے تیار کھڑے ہیں، اللہ ہم سب کے عملی وفکری گناہوں کو معاف فرمائے۔

میرے عزیز! آپ پہلے شخص ہیں جس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا ہے، کاش! کہ آپ کے طریقہ پر دوسروں نے بھی عمل کیا ہوتا اور چند لمحات کے لئے کتب حدیث وفقہ کی طرف رجوع بھی کیا ہوتا، محض ضد اور عصبیت پر قائم نہیں رہتے تو ان کے لئے بھی بہتر ہوتا اور دین اور امت کے لئے بھی، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مکرہ کی دی ہوئی طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے

گذارش عرض یہ ہے کہ میرے شوہر محمد فاروق ساکن سر بہدی نے میرے اور میرے والدین اور بستی کے چند لوگوں کے سامنے مجھے تین طلاق دے دی، پھر بستی کے ایک آدمی جن کا نام سید وارث امام ہے انہوں نے میرے شوہر سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا ہے، میرے شوہر نے جواب دیا کہ ہاں، پھر انہوں نے پوچھا کہ کتنی طلاق دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تین

طلاق ہم نے دیا، اب ان کے رشتہ داروں نے یہ بات اڑائی ہے کہ چونکہ پھسلا ڈرا اور دھمکا کر طلاق لیا گیا ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، حالانکہ یہ بات ایک دم غلط ہے، خود سے ہم دونوں کے مابین رضامندی سے طلاق ہوئی، اب حضور والا سے گذارش ہے کہ طلاق ہوگئی یا رجعی ہے، امید ہے کہ فوراً جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں جب آپ کے شوہر نے آپ کو تین طلاق دے دیا ہے اور گواہان بھی موجود ہیں تو آپ پر طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور آپ اپنے شوہر کے لئے بالکل حرام ہوگئیں، بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح جائز نہیں ہوگا(۱)، حلالہ شرعیہ کی صورت مشہور ومعروف ہے۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ڈرا دھمکا کر طلاق لے لیا گیا ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، درست نہیں ہے، کیونکہ بالفرض اگر لفظ طلاق کہنے پر جبر ودباؤ دیا گیا ہو، پھر بھی شرعاً طلاق واقع ہوجاتی ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے: ''ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو عبدًا أو مکرھا'' (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق علی مال طلاق بائن ہوتی ہے

مسماۃ زبیدہ خاتون بنت جناب ولی محمد کی شادی جناب علاء الدین ولد بشارت موضع داموسرائے سے ایک عرصہ ہوا ہوئی تھی، قریب چھ سال کی مدت گذرنے کے بعد لڑکی نے طلاق طلب کی اور لڑکا نے تحریری طور پر طلاق بھی دے دیا جس کے ثبوت میں طلاق نامہ منسلک کیا جارہا ہے، اس سانحہ کے قریب آٹھ ماہ گذر جانے پر لڑکی خود سے لڑکے کے گھر چلی گئی اور دوبارہ عقد

---

(۱) ''فإن طلّقها فلا تحلّ له من بعد حتّى تنكح زوجا غيره'' (سورۂ بقرہ/ ۲۳۰)۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۳/ ۲۳۵ طبع پاکستان۔

کر کے دونوں بہ حیثیت زن وشوہر ایک ساتھ رہنے لگے جس کے نتیجہ میں قریب گیارہ مہینہ پر ایک بچہ بھی ہوا، تو کیا ایسی صورت میں ان دونوں کا طلاق اور پھر دوبارہ عقد کرنا شریعت کی رو سے درست ہوا؟

طلاق نامہ یہ ہے: داموسرائے وصیر نجیب پور کے سبھی پنچوں کے سامنے تاریخ ۲۰/۶/۶۹ کو بشارت میاں کا لڑکا محمد علاء الدین نے ولی میاں کی لڑکی زبیدہ خاتون کو، سب سامان لیتے ہوئے طلاق دیا، (محمد علاء الدین)۔

الجواب وباللہ التوفیق

منسلکہ طلاق نامہ کا مضمون یہ ہے "صیر نجیب پور وداموسرائے کے سبھی پنچوں کے سامنے تاریخ ۲۰/۶/۶۹ کو بشارت کا لڑکا محمد علاء الدین نے ولی میاں کی لڑکی زبیدہ خاتون کو، سب سامان لیتے ہوئے طلاق دیا" یہ طلاق نامہ خلع ہے اور طلاق علی مال طلاق بائن ہوا کرتی ہے (۱)۔

لہذا اس طلاق نامہ کی رو سے زبیدہ خاتون پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور اس صورت میں عدت کے اندر یا عدت گذرنے کے بعد ہر دو حال میں زبیدہ خاتون کا دوبارہ نکاح علاء الدین کے ساتھ جائز ہے، لہذا جب زبیدہ خاتون نے دوبارہ نکاح علاء الدین کے ساتھ کیا تو یہ نکاح صحیح اور درست ہوا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لفظ "جواب دیا" سے کون سی طلاق پڑتی ہے

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ہذا میں:

زید نے گھریلو معاملہ کی بنا پر اپنی بیوی ہندہ کو مارا اور زبان سے مندرجہ ذیل الفاظ بیوی کو کہا:

ایک جواب، دو جواب، تین جواب، ہمارے یہاں سے جاؤ۔ صورت مذکورہ

(۱) "(الواقع بہ) ولو بلا مال (وبالطلاق) الصریح (علی مال طلاق بائن)" (الدر المختار علی رد المحتار ۳/۴۴۴ طبع پاکستان)۔

میں کون سی طلاق واقع ہوئی؟ کیا کوئی صورت جواز کی ہے یا نہیں؟

مذکورہ جملہ صرف چار عورتوں نے سنا، مرد کوئی موجود نہیں تھے، چار عورتوں کا بیان یہ ہے کہ زید نے کہا کہ ایک دو تین جواب دے دیا۔

الجواب وباللہ التوفیق

ثبوت طلاق کے لئے صرف عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے، اس لئے شوہر کے قول کا قسم کے ساتھ اعتبار ہوگا۔ اور جب زید کو اقرار ہے کہ زدوکوب کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا: "ایک جواب، دو جواب، تین جواب، ہمارے یہاں سے جاؤ" تو ایسی صورت میں اس کی بیوی ہندہ پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور وہ اس کی بیوی نہیں رہی، اگر وہ دونوں پھر میاں بیوی کی طرح ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح کر لینا جائز ہے۔

لفظ "جواب دیا" الفاظ کنائی میں سے ہے، لیکن عرف عام میں طلاق کے مفہوم میں مستعمل ہونے کی وجہ سے اس لفظ سے طلاق واقع ہونے کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہے، مگر اس لفظ سے طلاق بائن ہی واقع ہوگی، صورت مسئولہ میں جب شوہر نے بعد زدوکوب بیوی سے کہا: "ایک جواب" تو اس کی بیوی اسی وقت بائن ہوگئی، اس کے بعد محل طلاق نہیں رہی کہ اس پر دوسری یا تیسری طلاق واقع ہو، "البائن لا یلحق بالبائن" (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق بالشرط کا مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ ایک بار چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا، دوران گفتگو بحث یہ چل پڑی کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے "اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی کو طلاق ہے"، اس جملہ پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ دوسرے ساتھیوں کا کہنا

(۱) الدر المختار علی رد المحتار ۴/۵۴۰، ۵۴۲ بیروت۔

تھا کہ طلاق واقع ہوجائے گی، لیکن میں نے اس کی مخالفت میں یہ بات کہی کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اس پر ساتھیوں نے کہا اگر نہیں واقع ہوگی تو تم یہ کہہ دو تو جانیں کہ اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی کو طلاق ہے، میں نے بھی ضد میں آکر مذکورہ بالا جملہ کو تین بار کہہ دیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر گیا اور میں اس کی تحقیق نہ کرسکا، پھر درازی مدت نے ذہن سے یہ بات نکال دی اور مجھے بالکل اس کا خیال دماغ میں نہ رہا کہ میں ایسا کرچکا ہوں، تقریباً پانچ سال بعد میری شادی ہوئی، میں بیوی کے ساتھ رہنے لگا، ابھی ایک ہفتہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساتھی سے جو بحث میں موجود تھا ملاقات ہوگئی، میں نے اس سے اپنی شادی کا تذکرہ کردیا تو وہ بہت ہی مغموم ہوگیا اور اس نے مجھے بہت ہی سمجھایا کہ تم نے تو شادی سے پہلے ہی طلاق دے رکھی تھی، تم کو وہ واقعہ بحث کا یاد نہیں، تم بیوی سے الگ ہوجاؤ، وہ تمہارے لئے حرام ہے، اب تک تم نے گناہ کیا وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا حضور والا سے گذارش ہے کہ مجھے صحیح اور شریعت کے مطابق جواب سے ممنون فرمائیں کہ واقعی میری بیوی مجھ پر حرام ہے یا نہیں؟ اور اب اس سے تعلق قائم رکھنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مسئولہ میں جب کہ آپ نے شادی سے پہلے تین بار کہا تھا "اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی پر طلاق ہے" اس کے بعد آپ نے شادی کی تو اسی وقت آپ کی بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور وہ آپ پر حرام ہوچکی (۱)، اب بغیر حلالہ شرعی کے آپ کے لئے اس سے دوبارہ نکاح کرنا بھی حلال نہیں ہے، حلالہ کی صورت مشہور ومعروف ہے۔ واضح رہے کہ حلالہ کے بعد مذکورہ بیوی سے یا کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کی صورت میں آئندہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

(۱) "فلو قال: المرأة التي أتزوجها طالق تطلق بتزوجها" (الدر المختار علی رد المحتار ۴/ ۵۹۴ طبع بیروت)۔

عالمگیری میں ہے: "إذا أضاف الطلاق إلى النكاح وقع عقيب النكاح نحو أن يقول لامرأته إن تزوجتك فأنت طالق" (۱)۔

اور درمختار میں ہے: "لو قال إن دخلت الدار فأنت طالق، إن دخلت الدار فأنت طالق، إن دخلت الدار فأنت طالق وقع الثلاث" (۲)۔

وقال الشامي: يعني بدخول واحد الخ (۳)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لفظ "تلاک" میں نیت کا اعتبار

میرے سسر اور والد کے درمیان کچھ نااتفاقی چل رہی تھی جس کی وجہ کر میرے والد مجھے میری بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کررہے تھے، لیکن میں طلاق دینا نہیں چاہتا تھا، عید کے موقع پر کسی معمولی بات کو لے کر گھر میں جھگڑا ہوگیا، میری بیوی کو وہ گالی دینے اور مار پیٹ کرنے لگے، میں نے اپنی بیوی کو میکے پہنچادیا، میرے کچھ ساتھیوں نے مجھ سے کہا: تم ایک شرط لکھو کہ ساس، سسر یا سالا یا بیوی وغیرہ سے دو سال تک کسی طرح کا لگاؤ اور آنا جانا نہیں ہوگا، مگر کچھ الفاظ غلط کردو، تاکہ اس کا معنی مطلب درست نہ ہو، چنانچہ میں نے اس طرح کی شرط لکھی، "من کہ اسلام الدین ولد محمد شفیع عرف شاہ محمد ساکن ابراہیم پور چکریان، پرگنہ گوپار، تھانہ مشترک ضلع سارن کا ہوں، اپنے والد سے اقرار کرتا ہوں کہ اپنی بیوی، اپنے سسر، اپنی ساس یا اپنے سالے سے دو برس تک کوئی قسم کا آنا جانا یا نسبت قائم نہیں رہے گی، اس شرط کے خلاف ورزی اگر میں نے کیا تو میری بیوی مجھ پر حرام ہوجائے گی، گویا کہ "تلاک تلاک تلاک"، فقط۔

(۱) الفتاویٰ الہندیہ، الفصل الثالث فی تعلیق الطلاق ۱/ ۴۲۰۔
(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۳/ ۷۶۳ طبع پاکستان۔
(۳) رد المحتار ۳/ ۷۶۳ طبع پاکستان۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں لفظ ''تلاک'' کہنے سے اگر آپ کی نیت طلاق کی نہیں تھی اور تحریر لکھنے سے پہلے کسی کو گواہ بنادیا تھا تو خواہ شرط پوری ہو یا نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوگی اور نہ آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوگی (۱)، فقط واللہ تعالی اعلم۔

طلاق سے متعلق متفرق سوالات

(۱) بیوی کا سامنے رہنا یا لڑکی کی غیر موجودگی طلاق کے وقت چل سکتی ہے کیا؟

(۲) بیوی کے سرپرست کو اطلاع دینا یا سرپرست کے بغیر چل سکتا ہے؟

(۳) ایک طرف سے ہوسکتا ہے کیا، یعنی کافی گواہ بھی شوہر کے ہیں اور بیوی موجود نہیں، نہ اس کے رشتے دار۔

(۴) طلاق کا نام لڑکی نے سنا نہیں، ایسا ہوسکتا ہے کیا؟

(۵) جب کہ بیوی کا سامان جہیز اور نقد روپیہ مہر بغیر دیئے ہوئے طلاق ہوسکتی ہے کیا، اگر ایسی طلاق لڑکی کو منظور نہیں تو اس وقت کیا کیا جائے؟

(۶) مہر طلاق کے ساتھ دینا چاہئے یا بغیر مہر دیئے طلاق ہوجاتی ہے؟

(۷) پہلے طلاق یا مہر یا دونوں ایک ساتھ؟

(۸) شریعت کے طریقہ سے کس طرح بیوی سے رشتہ توڑا جاتا ہے، اس غلط طلاق نامہ کو کون سا نام دینا چاہئے؟

(۹) اگر دوبارہ میاں بیوی کا رشتہ قائم رکھنا چاہیں تو کس طرح رکھنا چاہئے؟

(۱۰) اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑ ہی دینا ہے تو کیا کیا جائے؟

اس وقت لڑکی کی مرضی بالکل نہیں ہے کہ وہ ایسے شوہر کے ساتھ زندگی گذارے

---

(۱) "وإن قال: تعمدته تخويفا لم يصدق قضاء، إلا إذا أشهد عليه قبله، به يفتى" (الدر المختار علی رد المحتار ۴/۴۶۰ طبع بیروت)۔

جو بیوی کو ذلیل کرتا ہے اور ناحق بدنام کرتا ہے۔ تمام شرارت شوہر اور سسرال والوں کی ہے، ایسے طلاق اور رشتہ داری ہم کو منظور نہیں۔

یہ طلاق لڑکی قبول نہیں کررہی ہے، اس لڑکے کو اور اس کے لوگوں کو بدمعاش ٹھہرانا چاہتی ہے جن لوگوں نے یہ قیمتی زندگی ٹی وی کا سریل بنایا، وہ کہانی ہے، یہ زندگی ہے، تمام حالات معلوم کرائیں یا تنویر صاحب جو بک اسٹال پر رہتے ہیں ان کے پاس بھیج دیجئے، مہربانی ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق

(۱-۴) طلاق دیتے وقت بیوی کا سامنے رہنا یا الفاظ طلاق کا سننا ضروری نہیں ہے اور نہ لڑکی کے ذمہ داران کا وہاں حاضر رہنا ضروری ہے، اس کے بغیر بھی طلاق دی جائے تو لڑکی کو طلاق منظور ہو یا نہ ہو طلاق واقع ہوجائے گی (۱)، البتہ بہتر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان نباہ مشکل ہوجائے تو لڑکے اور لڑکی کے اولیاء اور ذمہ داران ایک جگہ بیٹھ کر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں، اگر نہ سلجھے تو دو گواہوں کے سامنے شرعی طریقہ پر طلاق دی جائے اور بیوی کے واجبات وحقوق ادا کئے جائیں، مناسب یہ ہے کہ کسی مقامی جانکار عالم یا ذمہ دار کو مجلس میں شریک کریں، باری تعالی کا ارشاد ہے: "وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا" (۲)۔

(۵-۱۰) اگر واقعۃً شوہر نے یہ طلاق نامہ تیار کراکے اپنے دستخط کے ساتھ بیوی کے نام روانہ کیا ہے تو اس کی روشنی میں ایک طلاق رجعی واقع ہوئی، اس لئے کہ نہ عدد طلاق کی صراحت ہے

---

(۱) "ولا يلزم كون الإضافة صريحة في كلامه لما في البحر لو قال: طالق فقيل له من عنيت؟ فقال امرأتي طلقت امرأته" (رد المحتار باب الصریح ۳/۲۴۸ طبع پاکستان)

(۲) سورۂ نساء/۳۵۔

(۳) "(والطلاق يقع بعدد قرن به لا به) نفسه عند ذكر العدد وعند عدمه الوقوع "بالصيغة" (الدر المختار علی رد المحتار ۴/ ۵۱۳، ۵۱۴ طبع بیروت)۔

اور نہ تکرار لفظ طلاق (۳)، لہذا شوہر کو حق ہے کہ تین حیض عدت کے اندر اندر وہ اپنی زوجہ کو دو گواہوں کے سامنے واپس لے لے (رجوع کرلے)۔ اگر رجوع نہیں کرے اور عدت گذر جائے تو لڑکی کو حق ہوگا کہ وہ اپنا نکاح کسی اور مرد سے کرلے اور چونکہ طلاق رجعی ہے، اس لئے بعد عدت بھی دونوں چاہیں تو آپس کی رضا سے آپس میں دوبارہ نکاح کر سکتے ہے، اگر شوہر بیوی کو لوٹانا نہیں چاہتا تو اسے چاہئے کہ اس کے حقوق بشمول مہر وسامان جہیز ونفقۂ عدت اسے فوراً ادا کردے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الفسخ

لڑکی کا اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار

مکرمی محترمی قبلہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب! مدظلہ العالی

سوال: والدین نے اپنی لڑکی کا عقد نکاح ایک لڑکے سے کئی سال پہلے کیا تھا، اب عقد نکاح کے بعد لڑکی کسی بھی طرح اس شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرتی ہے، نہ مرد خلع پر راضی ہوتا ہے اور نہ ہی وہ لڑکی کو طلاق دے کر اپنے عقد نکاح سے خارج کرتا ہے، عورت تو جوان ہے ہی، اب حالات بھی ایسے نہیں کہ عورت الزامات کی شکار نہ ہو، مرد ایک طرف نہ اس کو نان ونفقہ دیتا ہے اور نہ ہی اس سے ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے، آج چھ سات سال کا عرصہ بھی گذر گیا۔

آپ سے التماس ہے کہ شرعی رہنمائی فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق

اگر لڑکی کا اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار بلا وجہ شرعی ہے تو وہ لڑکی ناشزہ ہے اور مستحق نفقہ نہیں ہے، اور اگر کوئی وجہ شرعی موجود ہے، وہ کسی ظلم، کسی ضرر یا شریعت میں معتبر وجوہ کی وجہ سے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو اس کا یہ انکار جائز ہوگا اور پھر شوہر کا اس کے حقوق کی ادائیگی سے گریز کرنا اس کا تعنت ہوگا، اس صورت میں زوجہ اپنے تمام حقوق پانے کی مستحق ہوگی، اور اگر وہ ان اسباب کی بنیاد پر تفریق چاہے تو معتبر اسباب کو سامنے رکھ کر قاضی اس کا نکاح فسخ کر سکتا ہے(۱)۔

(۱) "المتعنت: الممتنع على الإنفاق ففي مجموع الأمير ما نصه: إن منعها نفقة الحال فلها القيام فإن لم يثبت عسره أنفق أو طلق، وإلا طلق عليه، قال محشيه: قوله وإلا طلق أي الحاكم من غير تلوم" (الحيلة الناجزه ۱۳۳ بحوالہ فتوی العلامہ سعید بن صدیق الفلاتی المالکی)۔

اور اگر یہ ظاہری اسباب موجود نہ ہوں، لیکن طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے وہ اس شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو شوہر کا فرض ہے کہ وہ امساک بالمعروف کی صورت نکالے، اگر ممکن نہ ہو تو تسریح بالاحسان یعنی خلع کی صورت میں زوجہ کو اپنے نکاح سے الگ کردے، اور اگر زوج دونوں میں سے کوئی صورت نہیں نکالتا اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں (فقہ مالکی) کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے (۱)۔

جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، بظاہر اب جس مقام پر معاملہ پہنچ گیا ہے کہ عورت نوجوان ہے، شوہر نہ اسے نان ونفقہ دیتا ہے اور نہ دیگر حقوق زوجیت ادا کرتا ہے، چھ سات سال کا عرصہ بھی گذر گیا، ایسی حالت میں فتنہ کا بھی اندیشہ ہے، لہذا قاضی تحرزاعن الفتنہ اور خطرۂ معصیت سے بچانے کے لئے بھی نکاح فسخ کرسکتا ہے۔

پس یہ معاملہ اگر آپ کے یہاں قاضی موجود ہوں تو ان کے پاس پیش کیجئے، یا پھر دار القضاء جنوبی دہلی ۶ ۷ A/۱، مین بازار، اوکھلانئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵ یا دار القضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ سے رجوع کرسکتے ہیں، دار القضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف سے ''رہنمائے دار القضاء'' اور ''کتاب الفسخ والتفریق'' نامی کتابچے بھی طلب کرسکتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حکم کے فیصلہ سے پہلے فریقین کا تحکیم سے رجوع کرنا

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید امام مسجد ہے، کچھ لوگوں نے اس پر الزامات لگائے، لہذا شرعی فیصلے کے لئے کچھ حضرات کو

(۱) "فقال مالک یجوز لحکم الزوج أن یطلق المرأة بدون رضاء الزوج ولحکم المرأة أن یختلع بدون رضاء المرأة ویجب علیها المال إذا رأی الصلاح في ذلک، حیث ملّک علی الحکمین الجمع والتفریق وکذّب الزوج علی نفي التفرقة" (التفسیر المظہری ۲/۱۰۱ طبع رشیدیہ پاکستان)۔

مقرر کیا گیا، دوران سماعت جو حکم (ثالث) ہے اس کے رویے سے زید اور کچھ دوسرے لوگ خصوصاً زید کے حمایتی حضرات کو جانبداری کا شبہ ہوا، حتی کہ حکم حضرات میں سے دو ایک نے دوران سماعت یہی بات کہی، اس صورت میں زید کو انصاف کی امید نہیں رہی تو کیا اسے شرعاً یہ حق ہے کہ حکم کی تبدیلی کا مطالبہ کرے؟ اگر حق نہ ہو تو جانبداری کی صورت میں اسے انصاف کیسے ملے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق

فریقین اپنے مقرر کردہ حکم (ثالث) کی تحکیم اور ثالثی سے، فیصلہ سے پہلے پہلے رجوع کرسکتے ہیں، لیکن اگر حکم نے فیصلہ دے دیا تو اب وہ فیصلہ فریقین پر لازم ہوگا، اب ثالثی سے رجوع جائز نہیں ہوگا۔

البحر الرائق میں ہے: "ولکل واحد من الحکمین أن یرجع قبل حکمه، فإن حکم لزمهما" (۱)۔

(۱) البحر الرائق ۷/۲۶، رد المحتار ۸/۱۳۰، الفتاوی الہندیہ ۳/۳۹۷۔

کتاب النفقۃ

نفقۂ مطلقہ کب تک شوہر پر واجب ہے؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

میری ہمشیرہ جس کی عمر تقریباً ۴۵ رسال ہوگی، ۲۶ رسال قبل اس کی شادی ہوئی تھی، اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ بڑے لڑکے کی عمر ۲۳ رسال ہے جو موٹر میکینک کا کام سیکھ رہا ہے اور ہزار روپے ماہوار بطور وظیفہ مل رہا ہے، لڑکی کی عمر ۲۰ رسال اور چھوٹے لڑکے کی عمر ۱۶ رسال ہے، مذکورہ تینوں اولاد میں سے ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے، تین سال قبل اچانک بڑے لڑکے کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ چند ماہ کے مسلسل علاج سے لڑکے کا دماغی توازن تو ٹھیک ہوگیا، مگر اس کی والدہ یعنی میری ہمشیرہ کا (اپنے لڑکے کا دماغی توازن خراب دیکھ کر) دماغی توازن چلا گیا، اب اس کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں ہے، اس دماغی خرابی کی وجہ سے وہ سخت سست بکواس بھی کرتی ہے، جس پر اس کے شوہر نے غصہ میں تنگ آکر بجائے علاج کرانے کے اسے تینوں طلاق دے دی اور طلاق کی تحریری اطلاع مجھے کرادی۔ اب جواب طلب سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورت حال میں کیا شوہر کے طلاق کے بعد میری ہمشیرہ کی گذر بسر کی ذمہ داری مذہبی لحاظ سے اس کے شوہر پر بنتی ہے، جب کہ طلاق کا سبب بیماری بنا اور بیماری سے پہلے دوران شادی شدہ زندگی میری ہمشیرہ نے اپنے شوہر کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور میری ہمشیرہ کا میکے یعنی والدین کے مال میں بطور وراثت کے کوئی حق باقی نہیں رہ گیا ہے جو اس کا ذریعۂ معاش بن سکے، نیز بچوں کو والد کی طرف سے یہ دھمکی ہے کہ اگر تم نے اپنی ماں کی کفالت اور دیکھ بھال کی تو میں تم کو اپنی جائداد سے بے دخل

کردوں گا۔

ازراہ کرم میرے سوال کا مذہبی روشنی میں جواب سے مطلع فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق

شوہر جس نے طلاق دے دی اب وہ اجنبی ہے، عدت کا نفقہ اس پر واجب ہے (۱)، رہا اب اس خاتون کی کفالت کا مسئلہ تو از روئے شرع یہ اس کے بیٹے پر واجب ہے (۲)، اس کے باپ کا اس کو منع کرنا گناہ ہے، ایسے مسئلہ میں باپ کی بات نہیں مانی جائے گی، اگر لڑکا اس لائق نہیں ہے کہ اپنی ماں کی کفالت کر سکے تو باپ اور باپ نہیں ہو تو بھائی پر اس کی کفالت واجب ہے، شرع نے کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑا ہے۔

ویسے اس مرد نے جن حالات میں اپنی زوجہ کو طلاق دی ہے یہ بہت بڑی بُرائی اور ظلم ہے، اگر سماجی طور پر ممکن ہو تو اس شخص کو مناسب اور ممکن سزا دی جانی چاہئے، تا کہ دوسروں کو عبرت ہو، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نفقۂ عدت کی مقدار

گذارش ہے کہ میرے اکلوتے بیٹے محمد طارق کی شادی شیبا تبسم کے ساتھ ہوئی

---

(۱) مدت عدت میں نفقہ کے ساتھ سکنیٰ بھی شوہر پر واجب ہے، جیسا کہ کتب حدیث میں مصرح ہے: "عن جابر عن النبي ﷺ قال: المطلقة ثلاثاً لها السكنى والنفقة" (سنن الدارقطنی ۴/۲۱ طبع عالم الکتب بیروت)، "قلت كلهم ثقات على اختلاف في بعضهم" (اعلاء السنن ۱۱/۲۷۹ طبع پاکستان)، کتب فقہ میں "کسوہ" کا بھی اضافہ ہے: "و(تجب النفقة والسكنى) وكذا الكسوة كما في أكثر المعتبرات" (مجمع الأنہر فی شرح ملتقی الابحر ۱/۴۹۵)۔

(۲) "أما نفقة الوالدين فلقوله تعالى "وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً" أي أمر ربك... ووصى بالوالدين إحساناً والإنفاق عليهما حال فقرهما من أحسن الإحسان..." (بدائع الصنائع ۴/۳۰ طبع کراچی پاکستان)۔

اور بھائی پر نفقہ واجب ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے: "...... ابدأ بمن تعول أمك وأباك وأختك وأخاك ..." (سنن النسائی ۵/۶۱ طبع استنبول)۔

تھی، لڑکی کا مہر ۱۵۰۰۰ ار ہزار روپے تھا۔ آپس میں کافی نا اتفاقی کی وجہ سے دونوں کی طلاق ہوگئی، میرا لڑکا سلائی کا کام کرتا ہے جس کی آمدنی محدود ہے۔
میں آپ سے فتویٰ لینا چاہتا ہوں کہ مہر کے علاوہ لڑکی کو عدت کا کتنا خرچ دیا جائے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق

اپنی آمدنی اور لڑکی کی رہائش کے معیار کو سامنے رکھ کر اوسط درجہ کا نفقہ دیا جائے گا، بہتر ہے کہ یا تو دونوں فریق کسی ایک مقدار پر اتفاق کرلیں یا قاضی کے پاس درخواست دے کر طے کرالیں (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر اور نان ونفقہ کا مطالبہ

بخدمت بابرکت علماء دین وشریعت!
بعد سلام سنت الاسلام گذارش یہ کہ میرا شوہر ایک وقت میں تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر مجھے طلاق دے گیا اور قریب دو سال سے نہ مجھ سے کوئی رابطہ ہے نہ واسطہ، نہ کسی طرح کی کفالت کی ہے، آپسی منافرت کی انتہا ہے اور اب اس کے ساتھ میرا گزارہ قطعی ناممکن ہے، براہ کرم حکم شرعی بیان فرمائیں۔
۱- کیا مجھے طلاق ہوگئی؟
۲- کیا میں ابھی اور عدت طلاق گذارنے کی پابند ہوں؟

(۱) حضرت جابرؓ سے مروی ہے: "سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: للمطلقة الثلاث النفقة والسكنى مادامت في العدة" (سنن الدارقطنی ۴ / ۲۱)۔
جہاں تک اس کی مقدار کی بات ہے تو اس کا واضح ذکر فقہی کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ مجمع الانہر کے حاشیہ میں اوسط درجہ پر سامان کفایت کا ذکر ہے: "قال والسلام تشير إلى أنها غير مقدور فإنها ما يكفيها من الوسط كما في المحيط" (در المنتقی علی ہامش مجمع الانہر ۱ / ۴۹۵ طبع بیروت)۔

۳- کیا میں مہر ونان ونفقہ اپنا اور بچوں کا مانگ سکتی ہوں؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱- صورت مسئولہ میں جب کہ شوہر نے تین بار طلاق دے دی جس کو دو سال کا عرصہ گذر چکا، تو تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی، تاریخ طلاق سے عدت گذار کر آپ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہیں (۱)۔

۲- جب طلاق دئے ہوئے دو سال گذر گئے تو بظاہر اس کی عدت گذر چکی ہے، عدت تین حیض ہے، حاملہ ہو تو ولادت تک ہے اور اگر عمر زیادہ ہو، یا عمر کم ہو اس لئے حیض نہیں آتا ہو تو تین مہینہ ہے (۲)۔

۳- مطلقہ خاتون اپنا مہر اور اپنی عدت کا نفقہ اور اپنے بچوں کا نفقہ شوہر سے مانگ سکتی ہے (۳)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا بالغ لڑکیوں کا نفقہ والد پر واجب ہے؟

زید ایک سرکاری ملازم ہے جس کی دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی کو ایک لڑکی بالغ یعنی بیس سال (غیر شادی شدہ) اور دوسری بیوی کو پانچ بچے ہیں، جس میں تین

(۱) قرآن کریم میں ہے: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" (سورۂ بقرہ / ۲۳۰)۔
(۲) جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" (سورۂ بقرہ / ۲۲۸)، "وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (سورۂ طلاق / ۴) اور "وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ... "فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ" (سورۂ طلاق / ۴)۔
(۳) گذری ہوئی عدت کا نفقہ شوہر کے ذمہ باقی رہے گا یا ساقط ہو جائے گا؟ اور بیوی کو اس کے مطالبہ کا حق ہوگا یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کے یہاں دو رائیں پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ ساقط نہیں ہوگا اور بیوی کو اس کے مطالبہ کا حق ہوگا، اس رائے کے قائل حلوانی ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ مدت گذر جانے کے بعد وہ شوہر کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، یہ رائے امام سرخسی کی ہے، لیکن موجودہ زمانہ میں چونکہ حقوق کی ادائیگی میں عام طور پر کوتاہی برتی جاتی ہے اور ٹال مٹول کیا جاتا ہے، اس لئے حقوق کی حفاظت کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے گذری ہوئی عدت کا نفقہ شوہر سے ساقط نہ ہونے والی رائے ہی زیادہ مناسب ہے، دیکھئے: رد المحتار ۵ / ۳۳۳ طبع بیروت۔

لڑکیاں اور دولڑکے۔ جس میں سے ایک لڑکی بالغ عمر ۱۸ رسال (غیر شادی شدہ) اور ایک لڑکا بھی بالغ یعنی ۱۹ رسال ہے۔ زید نے تیسری شادی کر لینے کے بعد سے ان دونوں بیویوں اور بچوں کا کھانا، کپڑا، رہائش بند کردیا ہے، کسی طرح دونوں بیویاں اپنی زندگی گذارنے کی کوشش کرتے ہوئے زندگی گذار رہی ہیں۔

ہمارے دوست جو گذشتہ سال ہی ایڈوکیٹ بنے ان کے ذریعہ عدالت میں دونوں بیویوں کی جانب سے دو مقدمے UNDER SECTION 125C. R. P. C. دائر کے گئے، معزز جج صاحب نے AWARD MAINTANANCE کرتے ہوئے بالغ لڑکی یعنی عمر ۱۸ رسال کے دعویٰ کو یہ کہہ کر خارج کردیا کہ لڑکی بالغ MAJOR ہوگی؟ اس کی اپیل UNDER SECTION 125 (1) (B) CR. P. C. کے تحت داخل کی گئی جو قبول کرلی گئی، (FANIAL HEARING) بحث کے موقع پر اس لفظ پر زیادہ توجہ دی گئی کہ ایسی بالغ غیر شادی شدہ لڑکی عمر ۱۹ رسال جس کو خود اس کا باپ جو سرکاری نوکر ہے MAINTAIN نہیں کررہا ہے، ایسی صورت حال میں لڑکی جو خود اس قابل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو MAINTAIN کرسکے، صرف باپ ہی بالغ لڑکی کو MAINTANANCE کرنے کا ذمہ دار ہے، معزز شیشن جج صاحب نے فیصلہ محفوظ رکھا۔

تمام سینیر ایڈوکیٹس کی رائے ہے کہ بالغ لڑکی کو MAINTANANCE پانے کے لئے قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے، قانون میں صرف پاگل بالغ لڑکی MAINTANANCE پانے کی حق دار ہے۔

جب قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ ایک بالغ لڑکی (عمر ۱۹ رسال)

ہوجانے کی وجہ سے نفقہ سے محروم ہوجاتی ہے تو ایسی غریب لڑکی کا کیا ہوگا؟ کون سنبھالے گا اسے؟ یہ لڑکی بے یار و مددگار کدھر کدھر بھٹکے گی؟

ایسی لڑکی کے لئے شریعت کیا کہتی ہے؟ مسلم پرسنل لا بورڈ توجہ فرمائے، ایسی تمام مسلم بالغ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے کیا کرسکتا ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ کچھ اس طرح قانون بنانے کے لئے قدم اٹھایا جانا چاہئے کہ بالغ لڑکی کی شادی تک اس کا باپ MAINTANANCE کرتا یا MAINTANANCE (نفقہ) ادا کرتا۔

الجواب وباللہ التوفیق

از روئے شرع اسلامی اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اس سلسلہ میں قرآن کی آیت: "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (۱)۔ اور "وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ" (۲) سے استدلال کیا گیا ہے، اولاد میں اگر لڑکے ہوں تو بالغ ہونے تک ان کا نفقہ ان کے والد پر واجب ہے، اِلا یہ کہ لڑکے ہاتھ پیر سے معذور یا کمانے کے لائق نہ ہوں تو ان کا نفقہ باپ پر واجب رہے گا، لڑکی کے بارے میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ جب تک اس کا نکاح نہ ہوجائے اس کا نفقہ باپ پر واجب رہے گا، اِلا یہ کہ وہ خود ایسی جائداد رکھتی ہو، جس کی آمدنی سے اس کی کفالت ہوسکے۔

شریعت کا اصول یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت بے سہارا نہ رہے، اسی لئے لنگڑے، لولے اور معذور لڑکے کا نفقہ بالغ ہونے کے باوجود باپ پر برقرار رہتا ہے، لڑکیاں اگر ہوں تو شریعت انہیں کام کرنے اور روزی کمانے پر مجبور کرنا نہیں چاہتی، بلکہ جب تک غیر شادی شدہ ہیں، والد پر اور جب شادی ہوجائے تو شوہر پر اور اگر شوہر بھی نہ ہو اور بالغ اولاد ہو تو اس پر اس کا نفقہ واجب قرار دیا گیا ہے، اسی طرح شرع میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ کن حالات میں کس پر نفقہ واجب ہوگا اور آخر میں جب کوئی بھی کفالت کرنے والا موجود نہ ہو تو ریاست پر اس کی ذمہ داری

(۱) سورۂ بقرہ ر ۲۳۳۔
(۲) سورۂ بقرہ ر ۲۳۳۔

آتی ہے، اس سلسلہ میں کہ بلوغ کے بعد بھی شادی تک لڑکی کا نفقہ والد پر واجب رہتا ہے، فقہاء کی تصریحات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: "فالأناث علیه نفقتهن إلى أن يتزوجن إذا لم يكن لهن مال وليس له أن يواجرهن في عمل ولا خدمة وإن كان لهن قدرة وإذا طلقت وانقضت عدتها عادت نفقتها على الأب" (۱) (لڑکیوں کے پاس اگر مال نہ ہو تو شادی تک ان کا نفقہ باپ پر ہے اور باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ لڑکیوں کو اجرت پر کام میں اور خدمت پر لگائے، خواہ وہ اس کی قدرت رکھتی ہوں اور اگر اسے طلاق پڑ جائے اور اس کی عدت گذر جائے تو دوبارہ اس کا نفقہ باپ پر لوٹ آئے گا)۔

اور شامی میں ہے: "(وکذا) تجب (لولده الكبير العاجز عن الكسب) كأنثى مطلقًا" (قوله كأنثى مطلقًا) أي ولو لم يكن بها زمانة تمنعها عن الكسب فمجرد الأنوثة عجز إلا إذا كان لها زوج فنفقتها عليه مادامت زوجة" (۲) (اسی طرح اس لڑکے کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہوگا جو کمانے سے عاجز ہے جیسا کہ لڑکی کا نفقہ علی الاطلاق باپ پر واجب ہوتا ہے (خواہ انہیں کمانے کی قدرت ہو یا نہ ہو ہر دو صورت میں) (صاحب درمختار کا قول "كأنثى مطلقاً") یعنی اگر چہ لڑکی کو ایسا لونج پن نہ ہو جو اسے کمانے سے باز رکھے تو محض نسوانیت ایک عاجزی ہے، مگر جب کہ اس کا شوہر ہو تو جب تک وہ بیوی رہے اس کا نفقہ شوہر پر ہے)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: "ونفقة الأناث واجبة مطلقًا على الآباء ما لم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال كذا في الخلاصة" (۳) (اور لڑکیوں کا

(۱) فتح القدیر ۴/۱۷۳ طبع بیروت۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ۵/۳۴۱ طبع بیروت۔
(۳) الفتاوی الہندیہ ۱/۵۶۳ طبع بولاق مصر۔

نفقہ باپ پر مطلقاً واجب ہے جب تک ان کی شادی نہ ہو، اگر ان کے پاس مال نہ ہو، اسی طرح "الخلاصہ" میں ہے)۔

رہا مسئلہ .C.R.P.C 125 کا تو ظاہر ہے کہ یہ دفعہ .C.R.P.C (کریمنل پروسیجور کوڈ) کی ہے، اس کا تعلق دیوانی حقوق سے نہیں ہے، یہ محض فوری راحت رسانی کی دفعہ ہے، جو ایک حق دیوانی کے حصول کو فوری اور آسانی کے ساتھ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، چونکہ ہندوستان میں "مسلم پرسنل لا" نافذ ہے، جب بھی کوئی مقدمہ سول کورٹ کی صورت میں جج کے سامنے جائے گا وہ مسلم پرسنل لا کی روشنی میں اس پر مجبور ہوگا کہ لڑکی کو تا نکاح باپ سے نفقہ دلائے، ۱۲۵ چونکہ عارضی راحت رسانی کی دفعہ ہے اور اس میں جن کیٹیگوریز کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اولاد کے معاملے میں (Minor) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نابالغ کے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں بلوغ کے بعد اپنے حق نفقہ کے حصول کے لئے اس قانون سے فائدہ نہیں اٹھا پائیں، یہ اس قانون کا بڑا نقص ہے، مجھے دوسرے مذاہب کے بارے میں معلوم نہیں، لیکن شریعت محمدی کا قانون بے حد معقول اور منصفانہ ہے کہ جب تک لڑکیاں شادی شدہ نہ ہو جائیں باپ پر ان کی ذمہ داری عائد رہنی چاہئے۔ اگر اس قانون سے غیر مسلم لڑکیاں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں تو یہ عین تقاضۂ انصاف ہے، لہذا ضرورت اس کی ہے کہ لڑکیوں کو تا نکاح اپنے نفقہ کے حصول کے لئے دیوانی عدالت میں طویل مقدمہ بازی میں الجھانے کی بجائے انہیں (125C.R.P.C.) کے تحت فوری راحت دلانی چاہئے، اس سلسلہ میں ضرورت ایک چھوٹی سی ترمیم کی ہے کہ دفعہ ۱۲۵ میں جہاں (Minor) کا ذکر آیا ہے وہاں نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ لڑکیوں کے حق میں خصوصیت کے ساتھ "تا نکاح" کے لفظ کا اضافہ کیا جائے، لڑکوں کے سلسلہ میں بھی بعض خاص جزئیات جو بلوغ کے بعد ان کو مستحق نفقہ قرار دیتی ہیں ان کا اضافہ کیا جانا چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الوقف

باب الوقف علی الأولاد

وقف علی الاولاد کا حکم

محترم ومکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہندوستان پر برطانوی حکومت کے دور میں جب یہاں کی عدالتوں نے مسلمانوں کے وقف علی الاولاد کو قانونی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس وقت کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ پریوی کاؤنسل نے بھی عدالتوں کے اس موقف کی تائید کی تو اس کے خلاف ہندوستان کے علماء نے رائے عامہ ہموار کرنے کی مہم شروع کی اور بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز سے وقف علی الاولاد کے جواز کا قانون منظور کروالیا۔

پریوی کاؤنسل کے نزدیک وقف علی الاولاد کے قانوناً ناقابل تسلیم ہونے کے وجوہ میں بڑی وجہ یہ تھی کہ پریوی کاؤنسل کے ارکان اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے کہ اپنی ہی اولاد کی فلاح کے لئے جائداد کا وقف کرنا بھی اسلامی تصور میں صدقہ وخیرات کے دائرہ میں آتا ہے، اس کے رد میں ہمارے علماء نے قرآن، حدیث اور آثار صحابہ کے حوالہ سے کہا کہ شریعت اسلامی میں صدقہ وخیرات صرف غیروں ہی کے لئے نہیں، بلکہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی صدقہ وخیرات میں داخل ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷/۲ سے استدلال کیا گیا جس میں "ذَوِي الْقُرْبٰى" کا لفظ آیا ہے، آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ" (۹۲:۳) کے نزول کے بعد صحابی رسول حضرت ابوطلحہ کے اس واقعہ کو

پیش کیا گیا کہ انہوں نے اپنا دل پسند باغ رسول اللہ ﷺ کے مشورہ سے اپنے چچازاد بھائی پر صدقہ کیا، صحیح مسلم کی روایت پیش کی گئی جس میں اللہ کے رسول نے صدقہ کی مدات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ان میں سب سے زیادہ اجر اپنے بال بچوں پر صرف کرنے کا ملے گا"۔ نیز ترمذی شریف، ابن ماجہ اور نسائی میں وارد اس حدیث سے استفادہ کیا گیا کہ "مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہے، قرابت دار کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی"۔ صحابہ کے وقف علی الاولاد کی مثالیں پیش کی گئیں کہ حضرت زبیرؓ بن عوام نے اپنا ایک مکان اپنی مطلقہ لڑکیوں پر وقف کیا، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکہ کے مکان کو اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے طائف اور مکہ کے مکانات اپنی اولاد پر وقف کیں۔

غرض یہ ہے کہ اسلام میں صلہ رحمی کی ترغیب وتاکید ہے، صلہ رحمی کا دائرہ صرف اولاد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں دوسرے اعزہ واقرباء ("ذَوِي الْقُرْبٰى" ۲:۱۷۷) بھی شامل ہیں، علامہ شبلی نے اپنے رسالہ "وقف علی الاولاد" میں لکھا ہے: "...... اس بنا پر اسلام نے وقف کو اولاد اور اعزہ تک وسعت دی"۔

تو کیا وقف کے دائرہ کو صرف واقف کی اپنی اولاد تک محدود رکھنا صحیح ہے یا اپنی اولاد کے علاوہ دیگر اقرباء مثلاً حقیقی یا عم زاد بھائیوں، بہنوں اور ان کی اولاد، یا چچا، تایا وغیرہ اور ان کی اولاد اور اسی طرح دوسرے اقرباء اور ان کی اولاد پر بھی مثل وقف علی الاولاد وقف کیا جاسکتا ہے، اگر واقف کی اپنی اولاد کے علاوہ دوسرے اعزہ واقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف کیا جاسکتا ہے، تو اس کی تشہیر ہونی چاہئے، اس لئے کہ عام طور پر یہی خیال ہے کہ صرف وقف علی الاولاد ہی کیا جاسکتا ہے اور دوسرے اعزہ واقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر شرعاً یہ پوزیشن واضح ہے کہ دوسرے اعزہ واقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف قائم

کیا جاسکتا ہے تو اسلامک فقہ اکیڈمی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے باہمی تعاون سے اس بات کی تشہیر واشاعت کریں اور اس کے ساتھ ہی وقف علی الاولاد کے نافذ الوقت قانون میں ضروری ترمیم کروائی جائے اور اگر اس مسئلہ پر قطعیت کے ساتھ رائے نہیں دی جاسکتی تو فقہ اکیڈمی سوالنامہ مرتب کر کے گشتی خطوط کے ذریعہ علماء کی رائے حاصل کرے یا تیرہویں سیمینار کے لئے اسے موضوع بنائے۔

الجواب وباللہ التوفیق

وقف علی الاولاد اور وقف علی الاقارب سے متعلق آپ کے سوالات موصول ہوئے، ذیل میں مختصر اًجواب پیش ہے۔

ہر کار خیر پر وقف کرنا درست ہے، وقف کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "حبس العين وصرف المنفعة في جهة الخير المؤبدة" (۱)، چنانچہ سماج کے مختلف کمزور طبقات اور رفاہ عام کے متنوع کاموں پر وقف کی مثالیں دور صحابہ سے ہی ملتی ہیں۔

اعزہ واقرباء کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کی معاونت وکفالت بہت بڑا خیر ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے (۲)۔

احادیث میں اپنے اہل خاندان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک وصلہ رحمی کو دوہرے اجر کا موجب بتایا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ حضرت زینبؓ اور ایک خاتونؓ نے حضور ﷺ سے اپنے شوہر اور گود کے یتیم بچوں پر صدقہ کرنے کی بابت دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لهما أجران: أجر القرابة وأجر الصدقة" (۳) (ان دونوں کے لئے

---

(۱) اصل مال کو روکنا اور آمدنی کو دوائی مدات خیر پر خرچ کرنا وقف کہلاتا ہے۔

(۲) دیکھئے: "وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَّذِي الْقُرْبَىٰ" (سورۂ بقرہ/ ۸۳)، "وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ" (سورۂ بقرہ/ ۱۷۷)، "وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَّبِذِي الْقُرْبَىٰ" (سورۂ نساء/ ۳۶)، "إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ" (سورۂ نحل/ ۹۰) اور "يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ" (سورۂ بلد/ ۱۴)۔

(۳) الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاۃ ۴/ ۹۲ طبع قاہرہ۔

دو اجر ہیں: ایک قرابت کا اجر اور دوسرے صدقہ کا اجر)۔

حضرت میمونہ بنت حارثؓ نے حضور ﷺ کو ایک باندی آزاد کرنے کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لو أعطيتها أخوالك كان أعظم لأجرك" (۱) (اگر تم نے وہ باندی اپنے ماموں کو دیا ہوتا تو تمہیں زیادہ اجر ملتا)۔

بنوعذرہ کے ایک شخص نے اپنا مدبر غلام آزاد کر دیا، حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس غلام کو فروخت کر دیا اور قیمت آزاد کرنے والے شخص کو دے کر فرمایا: پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو، کچھ بچ جائے تو اپنے اہل پر خرچ کرو، اہل سے کچھ بچے تو اپنے قرابت داروں پر خرچ کرو......) (۲)۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "أعظمها أجرا الذي أنفقته على أهلك" (۳) (سب سے زیادہ اجر اس مال میں ہے، جو تم اپنے اہل پر خرچ کرو)۔

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو" (۴)۔

اس طرح کی متعدد احادیث میں اپنے بال بچوں، اہل خاندان اور قرابت داروں پر خرچ کو دیگر کار خیر میں خرچ پر ترجیح دی گئی ہے، اسی لئے صحابہ کرام نے تعلیمات نبوی اور اسوۂ نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے اہل خاندان وقرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کیا اور ان کے لئے

---

(۱) الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاۃ ۴/ ۹۲ طبع قاہرہ۔

(۲) پورا واقعہ اس طرح ہے: "عن جابر قال: أعتق رجل من بني عذرة عبدا له عن دبر فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فقال: "ألك مال غيره" فقال: لا، فقال: "من يشتريه مني" فاشتراه نعيم بن عبد الله العدوي بثمان مائة درهم، فجاء بها رسول الله ﷺ فدفعها إليه، ثم قال: ابدأ بنفسك فتصدق عليها فإن فضل شيء فلأهلك فإن فضل عن أهلك شيء فلذي قرابتك...... " (الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاۃ ۴/ ۹۰ طبع قاہرہ)۔

(۳) الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاۃ ۴/ ۸۹۔

(۴) "صلي أمك" (الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاۃ ۴/ ۹۰)۔

اوقاف قائم فرمائے۔

اسلامی تاریخ میں حضرت عمر بن خطابؓ کا قائم کردہ وقف نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے، خلیفہ دوم کا یہ وقف حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے وقف کے بعد اسلام میں اولین وقف تھا اور وقف کے بنیادی احکام وضوابط کا ذکر اسی وقف میں کیا گیا ہے، اس وقف سے متعلق روایت کے الفاظ لائق توجہ ہیں: "عن ابن عمرؓ أن عمر بن الخطاب أصاب أرضًا بخيبر فأتى النبي ﷺ يستأمره فيها فقال: يا رسول الله! إني أصبت أرضاً بخيبر لم أصب مالاً قط أنفس عندي منه، فما تأمرني به، قال: إن شئت حبّست أصلها وتصدقت بها، قال: فتصدق بها عمر أنه لا يباع ولا يوهب ولا يورث، وتصدق بها في الفقراء وفي القربى وفي الرقاب وفي سبيل الله وابن السبيل، والضيف لا جناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف أويطعم غير متمول" (۱) (حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر کی ایک زمین ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس زمین کے بارے میں مشورہ کرنے آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے جس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا، آپ ﷺ مجھے اس کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کے اصل کو باقی رکھ کر اس (کی منفعت) کو صدقہ کردو، ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس کو صدقہ کردیا اس شرط کے ساتھ کہ وہ نہ فروخت کی جائے گی، نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اور انہوں نے (اس کی منفعت) کو فقراء، اہل قرابت، غلام کی آزادی، اللہ کی راہ، مسافر اور مہمان کے لئے صدقہ کردیا اور یہ کہ اس کے متولی کے لئے کوئی حرج نہیں کہ اس میں سے معروف طریقے پر کھائے اور کھلائے، البتہ اس کو اپنے لئے مال نہ بنائے)۔

اس روایت سے واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کا وقف اہل قرابت پر بھی تھا، حضرت علیؓ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الشروط ۳/ ۱۸۵ طبع استنبول، اس کے علاوہ یہ حدیث الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ، صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ ۱/ ۱۲۵۵، سنن أبي داؤد، کتاب الوصایا ۳/ ۲۹۸ وغیرہ میں ہے۔

نے "ینبع" کی ایک زمین جن لوگوں پر وقف فرمائی تھی ان میں "ذوی الرحم" کے الفاظ آئے ہیں (۱)۔

حضرت ابوطلحہ نے بیرحاء کو جب اللہ کے لئے وقف کیا تو حضور ﷺ نے انہیں حکم فرمایا: "اجعلها في قرابتک" (۲) (اسے اپنے قرابت داروں کو دے دو)۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک عنوان قائم فرمایا ہے: "إذا وقف أو أوصى لأقاربه" (جب کوئی شخص اپنے اقارب کے لئے وقف یا وصیت کرے) اور اس باب کے تحت حضرت ابوطلحہ کا مذکورہ واقعہ نقل فرمایا ہے (۳)۔

امام ابوبکر احمد بن عمرو شیبانی معروف بہ خصاف کی اہم ومشہور کتاب "احکام الأوقاف" میں قرابت داروں پر وقف کے تعلق سے مذکور ہے: "اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میری یہ زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دائمی طور پر میرے قرابت داروں پر وقف ہے، وہ ختم ہوجائیں تو مساکین پر ہے، تو یہ وقف جائز ہے" (۴)۔ ایک دوسری جگہ پر امام موصوف نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل قرابت پر واقف جس ترتیب سے وقف کرے وقف درست ہوگا اور اسی ترتیب سے ان پر صرف کیا جائے گا (۵)۔

لہذا اقرباء پر وقف کیا جاسکتا ہے اور وقف علی الاقارب کے جواز میں کسی طرح کا کوئی تذبذب نہیں ہے۔

اب رہا سوال کہ قرابت داروں پر وقف کیا وقف علی الاولاد میں شامل ہے یا وقف علی

(۱) کتاب أحکام الأوقاف للخصاف / ۱۰۔

(۲) سنن أبي داؤد، باب في صلۃ الرحم ۲/ ۳۱۸ طبع استنبول، یہی روایت صحیح البخاری، کتاب الوصایا میں دوسرے الفاظ کے ساتھ ہے، نیز دیکھئے: معالم السنن شرح سنن أبي داؤد ۱/ ۶۸ طبع بیروت۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الوصایا ۳/ ۱۹۰ طبع استنبول۔

(۴) "أرأيت الرجل إذا قال: أرضي هذه صدقة موقوفة لله عزوجل أبداً على قرابتي فإذا انقرضوا فهي على المساكين؟، قال: الوقف جائز" (أحکام الأوقاف للخصاف / ۴۲ طبع قاہرہ)۔

(۵) أحکام الأوقاف للخصاف / ۱۶۴، ۱۶۵۔

الاقرباء مستقل نوع ہے؟ یہ قابل غور ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ اوقاف میں واقف جو الفاظ استعمال کرتا ہے ان میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے، علامہ ابن نجیم ''الاشباہ والنظائر'' میں لکھتے ہیں: ''ألفاظ الواقفين تبتني على عرفهم'' (۱) (وقف کرنے والوں کے الفاظ ان کے عرف پر مبنی ہوتے ہیں)۔

پس یہ دیکھا جائے گا کہ اولاد کے لفظ سے عرف میں کیا مراد لیتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) الأشباہ والنظائر ۲/ ۲۷۰۔

باب المقابر

قبرستان کی آمدنی کا مصرف

کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ پر:

۱- قبرستان جو بالکل لاوارث ہے، غیر محفوظ جگہ پر ہے، اس پلاٹ کی اراضی ۶۵/ ڈسمل ہے، بیچ کا حصہ آس پاس کے لوگوں نے مٹی کاٹ کاٹ کر بہت بڑا گڈھا بنادیا ہے، ایک چوتھائی زمین پڑتی (ویران، غیر آباد) قدیم ہے، اس میں قبر کے نشانات نہیں ہیں، یہ زمین مین روڈ پر واقع ہے، قیمتی زمین ہے، باقی حصہ میں زمانہ قدیم کے مزارات پختہ ہیں۔

مین روڈ سے متصل زمین پر پانچ چھ دوکانیں بن سکتی ہیں، اس کی آمدنی سے جو بڑا گڈھا ہے اس کو بھرا جاسکتا ہے، میونسپل ایریا میں ہونے کے سبب گورنمنٹ کے کسی فنڈ سے امداد بھی مل سکتی ہے، ایم پی اور ایم ایل اے فنڈ سے قبرستان کی چہار دیواری کے لئے مل سکتا ہے، مگر زمانہ کی گردش وتعصب کی نذر ہوگیا ہے، کوشش کی جارہی ہے، مگر گڈھا بھرنے کے لئے نہیں ملے گا، لہذا دوکانیں بن جانے سے اس کی آمدنی سے اس کو بھرا جاسکتا ہے۔

پڑتی زمین کے آس پاس شیشم وغیرہ کے درخت بھی لگائے جاسکتے ہیں۔

۲- درخت کی آمدنی کا مصرف کیا ہوگا؟ درخت کی آمدنی قبرستان کی مرمت وحفاظت میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟ تو پھر دوکانوں کو بھی بنانے کی گنجائش ہونی چاہئے، تاکہ اس کی آمدنی سے قبرستان کی حفاظت ومرمت میں خرچ کیا جائے۔

۳- قبرستان کے اندر کے درختوں کی آمدنی سے گاؤں، محلہ کے انجمن میں شادیوں کی ضروری اشیاء، جیسے دیگ، برتن، جنریٹر، دری وغیرہ خرید کر اپنے محلہ اور ارد گرد کے لوگوں کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور آمدنی بڑھائی جاسکتی ہے، کیا

شریعت میں اس کی اجازت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

سوال میں مذکورہ صورت حال میں اصل قبرستان کے ہی ضائع ہوجانے کا خدشہ ہے، اس صورت میں قبرستان کی سڑک کے کنارے خالی زمین پر (جہاں نئی قبریں نہ ہوں) دکان تعمیر کرالینا اور پھر اس کی آمدنی اس قبرستان کے تحفظ پر اور اگر اس قبرستان میں ضرورت نہ ہو تو دوسرے ضرورت مند قبرستانوں کی احاطہ بندی وغیرہ پر اور اگر یہ مصرف بھی موجود نہیں تو مسلمان بچوں کی تعلیم پر (جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے) صرف کرنا جائز ہے، فقط (۱)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ویران مقابر اور اوقاف کے احکام - بدلتے ہوئے حالات میں

عرصہ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قبرستان کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں، یہ جانتا ہوں کہ ''جنت البقیع'' میں ایک ہی جگہ پر چند برسوں کے بعد نئے مُردے دفن کئے جاتے ہیں، یہ بھی جانتا ہوں کہ سعودی عرب میں مزارات اور قبے مسمار کئے گئے اور پرانے قبرستان رفاہ عام کے کاموں میں لئے جاتے ہیں، بمبئی میں جگہ ختم ہونے پر عام قبرستان بند کردئے جاتے ہیں اور پھر اس کے چار برس کے بعد وہ قبرستان دوسرے مصرف میں لیا جاسکتا ہے، پرائیویٹ قبرستانوں کی بات اور ہے۔

پورے پنجاب میں گاؤں گاؤں قبرستانوں کی زمین غاصبانہ قبضہ میں چلی گئی اگر وہ باضابطہ حکومت کے حوالہ کی جائیں، معاوضہ کے ساتھ یا بغیر معاوضہ کے، وہ زیادہ بہتر ہے۔

(۱) "ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ وزرعه والبناء علیه" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۴۶ طبع امدادیہ ملتان)، نیز دیکھئے: ردالمختار ۳/۱۳۸ طبع بیروت، الفتاوی الہندیہ ۱/۱۶۷۔

بنگلور میں لوگ پرانے قبرستانوں کی زمین پر تجارتی عمارتیں بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔

الجواب وباللہ التوفیق

پرانی قبروں میں دوسری میت کی تدفین

۱- قبریں جب پرانی ہوجائیں اور بظاہر حال لاش مٹی ہوچکی ہو تو اس جگہ دوسری میت کو دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ جو فقہاء اسلام میں بڑا بلند مقام رکھتے ہیں، وہ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ کوئی قبر دوسری میت کے لئے نہ کھودی جائے، اِلا یہ کہ پہلی قبر پرانی ہوگئی ہو کہ ہڈیاں بھی نہ بچی ہوں، لیکن اگر دوسری جگہ نہیں مل رہی ہو تو ہڈیاں رہتے ہوئے بھی دوسرے مُردہ کو اس میں دفن کیا جاسکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے مُردہ کی ہڈیاں جمع کرکے ایک طرف رکھ دی جائیں اور نئے میت اور ان ہڈیوں کے درمیان مٹی وغیرہ کے ذریعہ آڑ بنادی جائے:

> ''ایک قبر دوسرے شخص کی تدفین کے لئے نہیں کھودی جائے گی، سوائے اس کے کہ پہلی نعش بوسیدہ ہوگئی ہو اور اس کی ہڈیاں تک نہ بچی ہوں، ہاں اگر کوئی دوسری قبر فراہم نہ ہوسکے تو پہلی نعش کی ہڈیاں ایک جگہ کردی جائیں گی، اور دونوں کے درمیان مٹی کی رکاوٹ بنادی جائے گی'' (۱)۔

رہا یہ کہ قبر پرانی نہیں ہوئی ہو اور اسے کھود کر دوسرے مُردے کو دفن کرنا پہلی میت کی بے حرمتی اور منکر یعنی ناپسندیدہ عمل ہے، اس لئے یہ درست نہیں ہوگا۔

''حلیہ'' نامی کتاب میں لکھا ہے: ''خصوصیت سے اس وقت جب اس میں ابھی ایک نعش بوسیدہ ہی نہیں ہوئی ہے، دوسرے کی تدفین مکروہ ہے، اور بعض جاہل

(۱) "ولا یحفر قبر لدفن آخر إلا إن بلی الأول فلم یبق له إلا عظم إلا أن لا یوجد بد فیضم عظام الأول ویجعل بینهما حاجزاً من تراب" (فتح القدیر ۲/۱۵۰ طبع بیروت)۔

گورکن جو نعش کو بوسیدہ ہونے سے پہلے ہی قبر کو کھود ڈالتے ہیں اور نئے مُردے دفن کردیتے ہیں اس کا منکر ہونا بالکل واضح ہے''(۱)۔

یہ بھی فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ ''ایک قبر میں دوسرے مُردہ کو دفن کرنا جس ضرورت اور مجبوری کے تحت درست ہے، اس کے ذیل میں اپنے رشتہ داروں کے قریب دفن ہونے کا جذبہ، یا اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرنے کا جذبہ داخل نہیں ہے، دوسرے قبرستان میں جگہ ہو تو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ ایک قبر میں دوسرا مُردہ دفن کردیا جائے''(۲)۔

زیلعیؒ نے اس کی تصریح کردی ہے کہ اگر قبر پرانی ہوچکی ہو اور لاش مٹی کی صورت میں بدل چکی ہو تو وہاں دوسری قبر بنائی جاسکتی ہے:

''اگر نعش بوسیدہ ہوگئی اور مٹی بن گئی تو دوسرے کا اس قبر میں دفن کرنا، اس میں کاشت کرنا اور اس پر عمارت بنانا جائز ہے''(۳)۔

علامہ شامیؒ نے اس سلسلہ میں اچھی بحث کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر میت کے لئے ایسی قبر فراہم کرنا جس میں کبھی کوئی دوسرا دفن نہیں ہوا ہو، ناممکن بات ہے، ورنہ زمین کا ہر حصہ قبروں سے بھر جائے گا، خاص کر بڑے شہروں میں سخت دشواری ہوگی، اس لئے اصول یہی بہتر ہے کہ قبر کی قدامت پر حکم کو مبنی رکھا جائے، اور قدیم قبروں پر جدید قبریں بنانے کی اجازت دی جائے:

''میں کہوں گا: اس میں بڑی مشقت ہے، اس لئے بہتر ہے کہ بوسیدگی کو کچھ دوسرے مُردہ کی تدفین کے جواز کے لئے مدار بنایا جائے، کیونکہ ہر مُردہ کے لئے ایسی قبر کی فراہمی جس میں کوئی اور دفن نہ ہو، چاہے پہلی نعش مٹی ہی کیوں نہ بن گئی ہو ممکن نہیں ہے، خصوصاً بڑے اور وسیع شہروں میں''(۱)۔

---

(۱) "وخصوصاً إن كان فيها ميت لم يبل، وما يفعله جهلة الحفارين من نبش القبور التي لم تبل أربابها وإدخال أجانب عليهم فهو من المنكر الظاهر" (ردالمحتار ۳/۱۳۸ طبع بیروت بحوالہ الحلیۃ)۔

(۲) ردالمحتار ۳/۱۳۸۔

(۳) "قال الزيلعي: ولو بلى الميت وصار تراباً جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۴۶ طبع امدادیہ ملتان)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبریں اگر قدیم ہوں تو ان پر دوبارہ قبریں بنائی جاسکتی ہیں۔

۲- رہا سوال سعودی عرب میں مزارات کا مسمار کیا جانا، تو ظاہر ہے کہ یہ متشدد سعودیوں کا کام تھا جسے اس زمانہ کے علماء نے بھی پسند نہیں کیا تھا اور نہ آج جو کچھ سعودی عرب میں ہو رہا ہے، اس کا ہر عمل شرعی حجت کا درجہ رکھتا ہے۔

قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا

۳- تیسرا سوال ہے قدیم قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا، میرے خیال میں اگر قبرستان کسی شخص کا ذاتی ہے، جیسا کہ اکثر بعض مقامات پر لوگ اپنی ذاتی ملک میں اپنے مُردوں کو دفن کرتے ہیں اور وہ اراضی اپنی ملک سے خارج نہیں کرتے اور نہ دوسروں کو دفن کی عام اجازت دیتے ہیں، ایسے مقابر میں اگر قبریں پرانی ہوجائیں اور لاش کے مٹی ہوجانے کا گمان غالب ہوجائے تو پھر ایسی پرانی قبروں کی جگہ پر نہ صرف یہ کہ دوسرے مُردوں کو دفن کرنا جائز ہوگا، بلکہ اس پر کاشت کرنا اور تعمیر کرنا بھی درست ہوگا، جیسا کہ زیلعیؒ کی تصریح میں نے اوپر نقل کی جس میں انہوں نے "جاز ...... وزرعه والبناء عليه"(۲) لکھا ہے۔

غرض یہ کہ مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک احترام میت، تو وہ قدامت کی وجہ سے رکاوٹ باقی نہیں رہا، دوسرے یہ کہ وہ اراضی ملک ہے یا وقف۔ تو ملک کی وجہ سے مالک کو ان کے مالکانہ تصرفات کے حقوق بھی حاصل ہوجاتے ہیں جو احترام میت کے پیش نظر قبروں کے جدید ہونے کی صورت میں اس کے لئے ممنوع تھے۔

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اراضی قبرستان کے لئے وقف صراحۃً کی گئی یا اذن عام

---

(۱) "قلت: لكن في هذا مشقة عظيمة، فالأولى إناطة الجواز بالبلاء، إذ لا يمكن أن يعد لكل ميت قبر لا يدفن فيه غيره، وإن صار الأول تراباً لاسيما في الأمصار الكبيرة الجامعة" (ردالمحتار ۳/۱۳۸، ۱۳۹ طبع بیروت)۔

(۲) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۴۶ طبع امدادیہ ملتان۔

دفن موتی کے لئے دے دیا گیا اور لوگوں نے اس میں دفن کرنا شروع کردیا، تو اس صورت میں اراضی وقف قرار پائیں اور اب ان پر وقف کا قانون نافذ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ قبرستان کی حیثیت عام وقف کی ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نہ حکم حاکم ضروری ہے اور نہ زبان سے کہنا اور نہ کسی متولی کا قبضہ ضروری ہے، اگر عملاً کسی اراضی پر مُردوں کو دفن کیا جانے لگے تو ملک زائل ہوجاتی ہے اور اس کی حیثیت عام وقف کی ہوجاتی ہے، یعنی قرائن وآثار سے اجازت کا واضح ہوجانا کافی ہے۔

> ''امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے واقف کی ملک زائل ہوجائے گی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب لوگ سقایہ سے پانی کھینچنے لگیں، مسافر خانوں اور رباطوں میں رہنے لگیں اور قبرستان میں تدفین شروع کردیں تب ملک زائل ہوگی اور مبسوط میں ہے کہ ان مسائل میں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے'' (۱)۔

اور جب قبرستان وقف ٹھہرا تو اب اس کی بیع درست نہیں اور نہ وہ کسی کی ذاتی ملک قرار دیا جاسکتا ہے۔

''اور جب وقف صحیح ہوگیا تو اب نہ اس کا بیچنا درست ہے اور نہ کسی اور کو مالک بنانا'' (۲)۔

لہٰذا جہاں تک قبرستانوں کی بیع کا سوال ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ قدیم اور ویران قبرستان جن سے دفن موتی کا مصرف عرصۂ دراز سے نہیں لیا جارہا ہے اور نہ آئندہ یہ مصرف لئے جانے کا بظاہر امکان ہے، ایسے قبرستان کی اراضی کو کیا کیا جائے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کا قوی امکان ہے کہ ان اراضی پر غاصب لوگ قبضہ کرلیں گے، جن کو ہٹانا، ناممکن ہے، یا بیحد دشوار، میری رائے میں ایسے قبرستان کی اراضی کو کرایہ (Lease) پر دیا جاسکتا ہے اور یہی اقرب إلی الفقہ ہے۔

(۱) "وعند أبی یوسفؒ بزول ملکه بالقول کما هو أصله وعند محمدؒ..." (الفتاوی الہندیہ ۲/ ۴۶۵)۔
(۲) "وإذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه" (الہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۰۴، ۲۰۵ طبع بیروت)۔

فقہاء نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے کہ اگر شی موقوف مقاصد وقف کو پورا کرنے کے لائق نہیں رہے تو اس کا دوسرا مصرف لیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟ اور اس سے آمدنی حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مثلاً کوئی عمارت وقف تھی اور وہ منہدم ہوگئی اور اب کوئی ایسا ذریعۂ آمدنی نہیں جس کے ذریعہ دوبارہ اسے آباد کیا جائے تو امام محمدؒ کے نزدیک وہ اراضی بانی یا ورثاء بانی کی طرف منتقل ہوجائے گی اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کی حیثیت وقف برقرار رہے گی، لیکن امام محمدؒ کا قول بھی اس صورت میں ہے جب کہ قطعی طور پر مفاد وقف کا حصول ختم ہوچکا ہو، اگر کسی صورت میں بھی استفادہ ممکن ہے تو پھر وہ بانی کی طرف نہیں لوٹے گی (۱)۔

مثلاً دکان جل کر خاک ہوگئی، تعمیر کا خرچ نہیں اور اسے کرایہ پر لگانے کی بھی کوئی صورت نہیں، لیکن اگر وہ اراضی ذریعۂ آمدنی ہوسکتی ہے تو وہ وقف برقرار رہے گی اور اسے اجارہ پر لگایا جاسکتا ہے۔

مختلف فقہاء نے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر مسجد سے متعلق بہت سے سامانوں کی منتقلی کا فتویٰ دیا ہے اور بعض لوگوں کے سامنے یہ صورت پیش آئی کہ بادشاہ وقت نے کسی ویران مسجد کے قیمتی پتھروں کو دوسری مسجد میں لگانا چاہا اور استفتاء کیا، انہوں نے شرنبلالی کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے اس سے منع کردیا، بادشاہ تو رک گیا لیکن پھر دوسرے لوگوں نے اس سے ذاتی فائدہ اٹھایا، جس پر انہیں سخت ندامت ہوئی، شامیؒ نے یہ ساری بحث ''نقل انقاض مسجد'' کی بحث میں کردی ہے (۲)۔

پس پنجاب وغیرہ کی صورت حال جہاں سرے سے ان قبرستانوں کے ختم ہوجانے کا خدشہ ہی یقینی ہے، ایسے مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک پہلو پر ایسا اصرار جس سے دین کے عام مصالح مجروح ہوتے ہوں صحیح نہیں معلوم ہوتے، لہٰذا ایسے قدیم مقابر جو عرصہ سے غیر آباد ہیں اور آئندہ بھی ان کے آباد ہونے کی توقع نہیں ہے، ان پر عمارتیں بنا کر کرایہ پر لگائی جاسکتی ہیں اور ان اراضی کو بھی لیز پر دیا جاسکتا ہے، تاکہ اصل اراضی وقف کی حیثیت میں باقی رہ سکے اور اس سے آمدنی حاصل ہوتی رہے۔

(۱) ردالمحتار ۶/ ۵۷۳ طبع بیروت، الفتاوی الخانیہ علی الہندیہ ۳/ ۳۱۴۔
(۲) ردالمحتار ۶/ ۵۵۰، ۵۵۱ طبع بیروت۔

"فتاویٰ خانیہ" میں ہے کہ مسافر خانہ جو رہ گذر سے دور ہو، گذرنے والے مستغنی ہوں اور راستے کے قریب ہی دوسری سرائے موجود ہو تو سید امام ابوشجاع کا خیال ہے کہ اس کا سامان دوسری سرائے میں استعمال کردیا جائے گا، جیسا کہ مسجد ویران ہوجائے اور گاؤں کے لوگ اس سے مستغنی ہوگئے ہوں، پھر معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے، وہ لکڑی فروخت کردے اور اس کی قیمت دوسری مسجد میں لگادے، تو جائز ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اب وہ واقف کی میراث شمار ہوگی، یہی حکم اس حوض کا بھی ہے جو عوامی مفاد کے لئے وقف کیا گیا ہے اور اب قابل استعمال باقی نہ رہا ہے(۱)۔

نیز ذخیرہ میں شمس الائمہ حلوانی سے منقول ہے کہ "ان سے ایسی مسجد یا حوض کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ویران ہوگئے ہوں اور لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کے باعث اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی ہو، کیا قاضی کو حق ہوگا کہ اس کے اوقاف کسی اور مسجد یا حوض میں لگادیئے جائیں، انہوں نے جواب دیا، ہاں" (۲)۔

اور ایسے ہی البحر الرائق میں "قنیہ" نامی کتاب سے نقل کیا گیا ہے "...... مناسب ہے کہ ایک وقف کا سامان دوسرے وقف میں منتقل کرنے کے مسئلہ میں امام ابو شجاعؒ، امام حلوانیؒ کے فتویٰ کی اتباع کی جائے کہ اس مسئلہ میں مسجد یا حوض کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، یہ دونوں پیروی کے لئے کافی ہیں، خصوصاً ہمارے زمانے میں، اس لئے کہ مسجد، سرائے یا حوض وغیرہ کو اگر منتقل نہ کیا جائے تو اس کے شکستہ حصے چور اور غارت گر اٹھالے جائیں گے، جیسا کہ مشاہدہ وتجربہ ہے، نیز خود اوقاف کے نگراں وغیرہ اسے کھاجائیں گے اور منتقل نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری مسجد بھی جس کو اس کی ضرورت ہے ویران ہوجائے گی" (۳)۔

(۱) الفتاوی الخانیہ علی ہامش الہندیہ ۳/ ۳۱۵، رد المحتار ۶/ ۵۴۹، ۵۵۰۔
(۲) رد المحتار ۶/ ۵۴۹، ۵۵۰ طبع بیروت، البحر الرائق ۵/ ۲۲۳۔
(۳) البحر الرائق ۵/ ۲۲۳۔

جب وقف کی عمارت منہدم ہوجائے اور اس شئی وقف کے لئے کوئی ایسا سامان نہ ہو جس کے ذریعہ اس کی تعمیر کی جاسکے تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ وقف بانی یا اس کے ورثاء کی طرف لوٹ جائے گا، بخلاف امام ابویوسفؒ کے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک وہ شئی واقف یا اس کے ورثاء کی طرف لوٹائی جائے گی جو مکمل طور پر اس لائق باقی نہ رہی ہو، جس مقصد کے لئے واقف نے وقف کیا تھا، مثلاً دکان جو جل گئی ہو، اور اس سے اب کچھ بھی کرایہ حاصل نہ ہوسکتا ہو اور مسافر خانہ اور حوض جو تباہ ہوگیا ہو اور اس کی تعمیر کے لئے کچھ نہ ہو اور جو عمارت کہ وقف کی گئی ہو، وہ واقف کی ملک میں واپس نہیں آسکتی، ...... اور اس کا میدان وقف ہی رہے گا، جو کرایہ پر دیا جائے گا، اگرچہ تھوڑا سا کرایہ حاصل ہو، بخلاف سرائے کے..... جہاں تک رستاق کی بات ہے تو وہ کبھی کبھی ویران ہوجاتا ہے اور وہ ڈھیر بن جاتا ہے اور وہ اس حالت میں ہوجاتا ہے کہ اگر عمارت کا شکستہ حصہ منتقل کردیا جائے تو اس کی زمین ایسے شخص کو کرایہ پر دی جاسکتی ہے جو تعمیر کرے یا درخت لگائے، اگرچہ کرایہ کم حاصل ہو(۱)۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین کے فتویٰ سے ہٹ کر متاخرین محقق علماء کی دوسری رائے قائم کرنے کی علت یہ ہے کہ وقف اپنے مقاصد کو پورا نہیں کررہا ہے اور اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو غاصبین اس پر قبضہ کرلیں گے، درانحالیکہ دوسری مساجد کو ضرورت ہے، پس اگر اس ویران مسجد کے سامان دوسری ضرورت مند مساجد کو منتقل کرنا ممنوع قرار دیا جائے تو اس فتویٰ کے ذریعہ دوسری مساجد کو ویران کرنا لازم آئے گا، لہذا مصلحت شرع اس کی متقاضی ہے کہ اس انتقال کو درست قرار دیا جائے۔

خلاصۂ بحث

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ غیر آباد قدیم اور ویران قبرستانوں کو اگر لیز پر لگادیا جائے تو ہزار ہا قبرستان جو ابھی آباد ہیں اور ان کا تحفظ خطرہ میں ہے، ایسے قبرستانوں کے تحفظ کی صورت نکالی

(۱) رد المحتار ۶/ ۵۴۹۔

جاسکتی ہے، لہٰذا میرے نزدیک شرع اسلام کی رو سے ایسے ویران اور قدیم قبرستانوں کو تعمیرات یا کاشت کے لئے لیز پر دیا جاسکتا ہے۔

اور اس طرح کی آمدنی کو اولاً دیگر مقابر کے تحفظ یا ایسے شہروں اور آبادیوں کے لئے قبرستان کی اراضی حاصل کرنے پر خرچ کرنا چاہئے جہاں قبرستان کی ضرورت ہے، اگر اس طرح کے مدات پر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو اسے مدارس، مسافر خانوں، نادار بچوں کی تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المساجد

مسجد کی زمین میں تدفین

مسجد کی زمین پر کسی خاص خاندان یا کسی بھی عام آدمی کو دفن کرنا کیسا ہے؟ اگر کسی نے مسجد کی زمین پر قصداً و جبراً دفن کردیا تو مدفون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس زمین پر مسجد کی تعمیر ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

مسجد کی زمین میں مردوں کی تدفین جائز نہیں ہے، واقف نے اس زمین کو مسجد پر وقف کیا ہے، تا کہ اس کا فائدہ اور منفعت مسجد کو حاصل ہو، اِلا یہ کہ واقف نے بوقت وقف اس کی بھی صراحتاً اجازت دے دی ہو، یہ خوب جان لینا چاہیے کہ باب وقف میں واقف کے منشاء اور اس کی غرض کی رعایت ضروری ہے، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: "ومراعاة غرض الواقفين واجبة" (۱)، اور یہاں اس زمین میں مردہ کو دفن کرنا واقف کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے جائز نہیں ہوگا۔

اگر وہ قبر اتنی پرانی ہوگئی ہو کہ اس کے آثار ونشانات مٹ چکے ہوں اور مردہ سڑ گل کر مٹی ہوگیا ہو تو بعینہ اس جگہ پر مسجد کی تعمیر جائز ہے۔ علامہ زیلعی نے لکھا ہے: "ولو بلي الميت وصار تراباً جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه" (۲) اور اگر قبر نئی ہو تو پھر اسے گھیر دیا جائے اور اس پر مسجد کی تعمیر کی جائے، فقط واللہ اعلم۔

مکانوں کے اوپر مسجد کی تعمیر

عرض خدمت یہ ہے کہ یہاں ایک مسلم کالونی میں بستی کے اہل خیر حضرات نے ایک جگہ خریدی ہے، شروع ہی سے ان کی نیت ہے کہ نیچے کمرہ جات بنائے

---

(۱) ردالمحتار ۶/ ۶۶۵ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۲) تبیین الحقائق ۱/ ۲۴۶ طبع امدادیہ ملتان، ردالمحتار ۳/ ۱۳۸ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

جائیں اور کرایہ پر دئے جائیں اور ان کمروں کے اوپر مسجد تعمیر کی جائے، نیچے کے کمروں کا کرایہ مسجد کے مصارف میں خرچ ہوگا، نیز نیچے ہی کمروں کے بازو میں وضوخانہ اور طہارت خانہ وغیرہ ہوں گے۔

آج کل شہروں میں جگہ کی قلت اور تنگی ہے، اگر نیچے ہی مسجد بنائی جائے تو طہارت خانے وغیرہ بننے کے بعد بہت تھوڑی جگہ بچتی ہے، اس چھوٹی سی جگہ پر کمرہ بنائے جارہے ہیں۔

آں محترم سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ ایا اس طرح مسجد کی تعمیر درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ جگہ کے خریداروں کی نیت شروع ہی سے نیچے کمرہ جات، طہارت خانہ اور اوپر مسجد کی تعمیر کی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مسجد کے نیچے سوائے مسجد کے اور کوئی عمارت نہیں بنائی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو طہارت خانے وغیرہ بھی تعمیر نہیں ہوسکیں گے۔

براہ کرم اس سلسلہ میں رہنمائی فرما کر مشکور فرمائیں۔

اپنی اولین فرصت میں جواب سے نوازیں یہ خصوصی درخواست ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

مسجد کی تعمیر اور بنا کے وقت اگر بانیان مسجد نے یہ طے کرلیا کہ منصوبہ کے مطابق نیچے کی منزل ضروریات مسجد، بیت الخلاء، وضوخانہ، امام ومؤذن کی رہائش یا مسجد کے انتظامی اخراجات کے لئے دکانیں جو ذریعہ آمدنی ہوں بنائی جائیں گی اور اوپر کی منزل پر مسجد ہوگی تو ایسا کرنا جائز ہوگا، اعتبار بوقت بناء مسجد کے بانیوں کی نیت کا ہوگا، البتہ جب مسجد بن چکی، اس کے بعد مسجد کی کسی منزل میں اس کی حیثیت کو بدلنا درست نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "(وإذا جعل تحته سرداباً لمصالحه) أي المسجد (جاز)" — "ولو بنى فوقه بيتاً للإمام لا يضر لأنه من المصالح، أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع" (رد المحتار ۶/۵۴۷، ۵۴۸ طبع بیروت)۔

کتاب الهبة والوصية

عقد ہبہ کے لئے قبولیت ضروری ہے

ہم نے جولڑکی کو بری میں سات جوڑے کپڑے چڑھائے تھے جن کو بہو کے گھر والوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ یہ دو دو سو روپے کے سوٹ ہیں، یہ دلہن کے لائق نہیں ہیں، لیکن اب وہ لوگ ان جوڑوں کو بھی مانگ رہے ہیں۔

برائے مہربانی آپ شریعت کی روشنی میں ان سب حالات کو پڑھ کر فتویٰ دیں آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق

جو کپڑے دلہن کو دئے گئے اور وہ ناپسند کرکے واپس کردئے گئے اور پھر ان کے بدلہ میں دوسرا کپڑا نہیں بھیجا گیا تو اب اس کا مطالبہ دلہن کی طرف سے صحیح نہیں ہوگا، چونکہ اس نے ہبہ کو قبول نہیں کیا اور شی موہوبہ کو اپنے قبضہ میں بھی نہیں رکھا اور عقد ہبہ کے لئے قبولیت ضروری ہے، لہذا ملک اس کی مؤکد نہیں ہوئی، اس لئے اب واپسی کا مطالبہ صحیح نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہبہ اور وصیت کا مسئلہ

حامداً ومصلیاً، عالی جناب مفتی صاحب! مدظلہ العالی

مندرجہ ذیل امور میں جو منسلکہ دستاویز سے متعلق ہیں استفتاء کیا جارہا ہے، امید کہ بہ عجلت ممکنہ فتویٰ تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں گے۔

من مستفتی محمد عبدالعزیز کے والد صاحب کا انتقال ماہ جنوری ۱۹۹۲ء میں ہوچکا

(۱) "(وركنها) ... (الإيجاب والقبول) ... وتصح (بقبول) (وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل" (الدر المختار علی رد المحتار ۸/۴۹۰، ۴۹۲، ۴۹۳ طبع بیروت)۔

ہے، ان کی یہ دستاویز منسلکہ ۱۹۸۶ء کی ہے، ان کی وفات کے وقت ان کی اولاد میں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اور ایک دوسری لاولد زوجہ تھی اور اب بھی حیات ہیں۔ پہلی زوجہ منکوحہ سے تمام اولاد ہوئی، جن کو میرے والد نے حین حیات طلاق دے دی تھی اور مہر بھی ادا کر دیا تھا، والد صاحب کی جملہ جائداد مندرجہ دستاویز مکسوبہ ہے، والد صاحب مرحوم نے مجھے تقریباً دس بارہ سال ہوئے بذریعہ اخبار رہنمائے دکن مجھے نافرمانی اور عدول حکمی وبغاوت کے تحت عاق کردیا تھا، لیکن والد مرحوم نے اپنی حیات میں وفات سے تقریباً چھ ماہ قبل ہم پانچوں بیٹوں اور ایک بیٹی کو اپنے پاس بلا کر نقد رقم اس طرح تقسیم کی کہ ہر بیٹے کو ڈھائی ڈھائی ہزار روپے اور بیٹی کو پانچ ہزار روپے نقد عنایت فرمائے اور ہر بیٹے کو مکانات کی تعمیر اور رہائش کے لئے پانچ پانچ پلاٹ اراضی دی، اس میں وہ بیٹے بھی شریک ہیں جن کو عاق کردیا تھا یا دستاویز میں ان کو جائداد متروکہ سے بھی محروم کردیا ہے۔

۱- کیا شرعی حیثیت سے عاق شدہ لڑکا محروم الارث قرار پاتا ہے یا مستحق ارث ہے اور اگر بھائی بہن ان کو حصہ دیں تو کیا وہ گنہ گار ہوں گے اور کیا مرحوم کی وفات سے چھ ماہ قبل کے سلوک اور احسان سے عاق ہونا یا محروم الارث ہونا کالعدم قرار پاتا ہے اور وہ جائداد میں مستحق وارث قرار پاتے ہیں؟

۲- دستاویز منسلکہ میں میرے والد صاحب مرحوم نے جو اپنی موجودہ زوجہ فاطمہ بیگم کو مکان (نمبر ۱،۱،۴۳) کے متصل ۲۵×۲۵ کے چار عدد کمرہ جات مہر کے تحت دے دیئے ہیں، کیا وہ ان کی مالک قرار پاتی ہیں؟ جب کہ ان پر ان کا قبضہ ثابت نہیں، کیونکہ تاحیات والد صاحب ہی کرایہ پر دیتے رہے اور کرایہ وصول کرتے رہے اور نہ دستاویز میں قبضہ کا ذکر ہے، دستاویز ہذا کے شروع میں وصیت نامہ درج ہے، ہبہ نامہ نہیں ہے۔

۳- امینہ بیگم وخدیجہ بیگم جو دستاویز ہذا میں ان کی حقیقی بہنیں ہیں، ۲۳ عدد کمرہ جات میں لڑکے اور لڑکیوں کے وارث ہوتے ہوئے یہ بھی وارث ہوسکتی ہیں اور مکتوبہ دسویں حصے کی یا کیا صورت ہوگی؟

۴- جائیداد متروکہ کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی؟ براہ کرم وضاحت سے لکھئے۔

مورث حاجی عثمان ولد عبداللہ پاریکھ، تین / پانچ بیٹے، ایک بیٹی، زوجہ لاولد، دو عدد بہنیں۔

نوٹ: براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اس دستاویز منسلکہ میں جو جملہ جائداد بتلائی گئی ہے، شرعی حیثیت سے کون کون مستحق قرار پاتے ہیں اور کتنی جائداد کے اور کون مستحق قرار نہیں پاتے۔

الجواب وباللہ التوفیق

میں نے حاجی عثمان صاحب ولد عبداللہ پاریکھ، ساکن عادل آباد کے وصیت نامہ مورخہ ۲/۹/۸۶ء کی فوٹو کاپی دیکھا، اس تحریر میں تین باتیں کہی گئی ہیں:

۱- ”جنگلات، آفس کے متصل خالی جگہ ۲۰×۱۰۰ کو میں نے میرے لڑکے عبدالغفار صاحب کو بیع دے کر رجسٹری کردیا ہے، رجسٹری کے بعد عبدالغفار صاحب نے اس بیع شدہ جگہ پر دس عدد نئے کمرہ جات تعمیر کئے ہیں، جس کو اندازاً دس سال کا عرصہ ہوتا ہے، جس پر وہ قابض ومتصرف ہے، ان کمرہ جات پر میرے ورثاء کو حق نہیں ہے“۔

میرے نزدیک یہ صورت بیع یا ہبہ کی ہے جس میں متعین اراضی (محل وقوع اور پیمائش کے ساتھ) مرحوم حاجی عثمان صاحب نے اپنے ایک لڑکے عبدالغفار کو دے دی، جس پر وہ قابض ودخیل ہوگئے، اگر ہبہ تسلیم کیا جائے تو بھی ہبہ تام ہوگیا، لہٰذا وہ شئ ملکیت عبدالغفار کی ہے، اس میں وارثوں کا حصہ نہیں ہوگا(۱)۔

۲- وصیت نامہ مذکور میں لکھا گیا ہے:

(۱) ”(وتتم) الھبۃ (بالقبض) الکامل“ (الدر المختار علی رد المحتار ۸/ ۴۹۳)۔

"چار عدد کمرہ جات روڈ سائڈ میں، میں نے اپنی بیوی مسماۃ فاطمہ بیگم صاحبہ کو مہر کے تحت دے دیا ہے، ان چار عدد کمرہ جات پر میرے ورثاء کو حق نہیں ہے"۔

میرے نزدیک یہ صورت بیع مقاصہ کی ہے، ہبہ کی نہیں ہے، بیع مقاصہ کا مطلب بعوض واجب دین کوئی شی اس شخص کے ہاتھ فروخت کردینا جس کا دین اس کے ذمہ واجب ہوتا ہے (۱)، شوہر پر بیوی کا مہر واجب ہے، اس مہر کے عوض جب وہ کوئی اراضی بیوی کو دے دیتا ہے اور اس طرح برابر سرابر کر کے مہر کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے تو یہ بیع مقاصہ ہے، ہبہ نہیں (۲)، لہذا اس میں قبضہ کی شرط نہیں اور اگر حاجی محمد عثمان صاحب اس میں کرایہ پر لگانے اور کرایہ وصول کرنے کا کام کرتے بھی رہے ہیں تو سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی بیوی کی طرف سے بہ حیثیت منتظم کار یہ فرائض ادا کرتے رہے ہیں، لہذا امکان مصرحہ وصیت نامہ چار عدد کمرہ جات جو روڈ سائڈ واقع ہیں، وہ مسماۃ فاطمہ بیگم کی ملکیت ہیں، اس پر ورثاء کا کوئی حق نہیں ہے۔

۳- حاجی عثمان مرحوم نے اپنی وفات سے تقریباً چھ ماہ پہلے ۵ بیٹوں کو نقد فی کس ڈھائی ہزار روپئے اور ایک بیٹی کو ۵/ ہزار روپئے دیئے اور ہر بیٹے کو مکانات کی تعمیر اور رہائش کے لئے ۵،۵/ پلاٹ اراضی دی جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، یہ صورت ہبہ کی ہے، اگر مرحوم حاجی محمد عثمان نے یہ اراضی ۵/ بیٹوں کو دے کر ان کو قبضہ دے دیا تو یہ ان ۵/ بیٹوں کی ملک ہوگئی، اب یہ وارثین کے درمیان قابل تقسیم نہیں (۳)۔

۴- وصیت نامہ ہذا میں باقی ۲۳ کمرہ جات اور خالی زمین کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اب رہا ۲۳ کمرہ جات مع خالی جگہ جو میرے قبضہ میں ہے، حسب ذیل ورثاء کے حق میں

(۱) "المقاصة: إسقاط دين مطلوب لشخص على غريمه في مقابلة دين مطلوب (جاری) من ذلک الشخص لغريمه" (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۸/ ۳۲۹، بحوالہ مرشد الحیران مادہ/ ۲۲۴)۔

(۲) "إذا كان للزوج عليها دين فقال: احسبوا لها نفقتها منه كان له ذلک لأن أكثرها في الباب أن تكون النفقة لها دينا عليه فإذا التقى الدينان تساويا قصاصاً، الا ترى أن له أن يقاص بمهرها فالنفقة أولى" (المبسوط للسرخسی ۵/ ۱۹۴ طبع دار الفکر بیروت، رد المحتار ۴/ ۲۴۰)۔

(۳) "(وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل" (الدر المختار علی رد المحتار ۸/ ۴۹۳)۔

قابل تقسیم ہے، محمد اسماعیل صاحب، عبد الغفار صاحب، محمد ہارون صاحب میرے حقیقی لڑکے ہیں، امینہ بیگم زوجہ عبد العزیز صاحب میری حقیقی لڑکی ہے، خدیجہ بیگم زوجہ محمد عمر صاحب، فاطمہ بیگم زوجہ حاجی نور محمد صاحب، یہ دونوں میری حقیقی بہنیں ہیں، ۲۳/ عدد کمرہ جات میں دونوں بہنوں کا دسواں حصہ نکالنے کے بعد ۳/ لڑکے، ایک لڑکی جن کے نام اوپر بتلائے گئے ہیں میرے مرنے کے بعد شرعی حصہ پائیں گے، دوسرے میرے دونوں لڑکے عبد العزیز پاریکھ، مصطفیٰ پاریکھ ان دونوں لڑکوں کو میں کافی مالی مدد کرتا رہا، دونوں نے میرے خلاف بغاوت کر دیئے ہیں اور مجھے مقدمہ بازی میں مبتلا بھی کئے ہیں، طرح طرح سے مجھے پریشان کئے اور ان دونوں نے مجھے روحانی صدمہ بھی پہنچایا، اس لئے میں ان دونوں کو جائداد سے محروم کر رہا ہوں، ان دونوں کو میری جائداد میں کسی قسم کا حق نہیں رہے گا، میرے مرنے کے بعد اگر میرے ورثاء ان کو جائداد میں حصہ دینا چاہیں تو وہ گنہ گار رہیں گے۔

میرے نزدیک یہ وصیت ہے اور وارثوں کے حق میں وصیت صحیح نہیں ہے (۱)، البتہ دونوں حقیقی بہنیں غیر وارث ہیں، اس لئے ان کے حق میں وصیت جائز قرار پائے گی اور چونکہ وصیت میں متروکہ مال کا دسواں حصہ دونوں بہنوں کو دینے کی بات کہی گئی ہے جو متروکہ کے ایک تہائی سے کم ہے، اس لئے یہ وصیت جائز اور نافذ قرار پائے گی۔

لہذا کل متروکہ مذکورہ وصیت نامہ ہذا کا دسواں حصہ دونوں حقیقی بہنوں کو دیا جائے گا اور حاجی عثمان صاحب کا یہ لکھنا کہ ان کے دو لڑکوں عبد العزیز پاریکھ اور محمد مصطفیٰ پاریکھ کو جائداد سے محروم کر دیا جائے، باطل قرار پائے گا، اس لئے کہ وراثت اللہ کی طرف سے دیا ہوا حق ہے، مورث کے عاق قرار دینے یا محروم کر دینے سے اللہ کے دیئے ہوئے حق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لہذا عبد الغفار کو دیئے ہوئے حصہ جس پر ہبہ مکمل ہو چکا ہے اور فاطمہ کو دین مہر میں دیئے ہوئے مکان، نیز آخر عمر میں پانچوں لڑکوں کو دیئے گئے پانچ پلاٹ کو چھوڑ کر جو کچھ بھی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ یا نقد

(۱) "عن أبي أمامة الباهلي قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله قد أعطى لكل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث ....." (سنن الترمذی باب ما جاء لا وصیۃ لوارث ۴/ ۴۳۳ طبع استنبول)۔

کی صورت میں حاجی محمد عثمان مرحوم نے چھوڑا اول اس میں سے ان کی تجہیز و تکفین کے اخراجات ادا کئے جائیں گے، بعد ازاں جو کچھ ان پر دین ہوگا وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد وصیت جو انہوں نے اپنی دونوں بہنوں کو کی ہے، وہ دی جائے گی، پھر جو کچھ بچ جائے اس کو ۸۸ حصوں پر تقسیم کر کے زوجہ کو ۱۱/۸۸ حصہ یعنی دو آنہ اور پانچوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو فی کس ۱۴/۸۸ یعنی دو آنہ ۶/عدد صحیح ۶/۱۱ پائی اور لڑکی کو ۷/۸۸ یعنی ایک آنہ ۳/عدد صحیح ۳/۱۱ پائی دیئے جائیں، حاجی محمد عثمان صاحب مرحوم کا لکھنا کہ اگر ان دونوں عاق شدہ لڑکوں کو حصہ دیا جائے تو حصہ دینے والے گنہ گار ہوں گے، غلط ہے، بلکہ حصہ دینا واجب ہے اور موجب ثواب ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کی وصیت باطل ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جنوبی افریقہ میں بیوہ عورتوں کی رہائش کا مسئلہ (۱)

الجواب وباللہ التوفیق

جنوبی افریقہ اور دوسرے وہ ممالک جو مغربی تہذیب سے متاثر ہیں، ان میں اجمالی

(۱) جنوری ۱۹۹۱ء میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ساؤتھ افریقہ کا سفر کیا، وہاں ان کے سامنے زبانی طور پر ایسے بہت سے مسائل پیش کئے گئے جو ساؤتھ افریقہ کے مخصوص حالات میں شرعی لحاظ سے حل طلب تھے، ان میں سے ایک سماجی مسئلہ بھی تھا جس کا تعلق بیوہ عورتوں کی رہائش سے تھا، چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ مغربی تہذیب جس کی بنیاد خود غرضی پر ہے، وہاں بوڑھے والدین کے حالات نہایت افسوسناک ہیں اور یہ اولاد کی طرف سے انتہائی بے توجہی کے شکار رہتے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ شوہر کے ترکہ میں اگر وہ صاحب اولاد ہو بیوی کا حصہ آٹھواں ہوتا ہے، چنانچہ بعض واقعات ایسے پیش آئے کہ والد کے انتقال کے بعد اولاد نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اپنے حصہ کی قیمت لے کر گھر خالی کر دے، ایک بوڑھی بیوہ خاتون کے لئے اس میں جو دشواری ہے وہ محتاج اظہار نہیں، اس بنیاد پر بعض مردوں نے زندگی میں اپنی جائداد بیوی کو ہبہ کر دی، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بیوی ہی کا انتقال پہلے ہو گیا، اب شوہر کا حصہ اس کے ترکہ میں ایک چوتھائی رہ گیا، تو یہی صورت حال اولاد کی طرف سے والد کو پیش آئی، یہ ایک ایسی تکلیف دہ صورت حال ہے جس سے جنوبی افریقہ اور مغربی ممالک میں لوگ دوچار ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان اور مشرقی ممالک اب تک اس طرح کے اخلاقی بگاڑ سے محفوظ ہیں۔ قاضی صاحبؒ نے اس مسئلہ پر ساؤتھ افریقہ کے زمانۂ قیام ہی میں ایک تفصیلی تحریر تیار کی، جس میں اس سماجی مسئلہ کا فقہ مالکی کے مطابق شرعی حل تجویز فرمایا اور وہاں کے بہت سے علماء کو اکٹھا کر کے وہ تحریر سنائی، ہر نقطہ پر بحث و گفتگو کے بعد ان علماء نے اپنے دستخط ثبت کیے۔
یہ حضرت قاضی صاحبؒ کی غایت احتیاط کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی اس تحریر کو اس نوٹ کے ساتھ ہندوستان

خاندان (Joint Family) کا تصور عملاً ختم ہوتا جا رہا ہے، اور افراد خاندان کے درمیان باہمی رشتے کمزور ہوتے جا رہے ہیں، جوان بیٹے شادی کے بعد عام طور پر والدین سے علیحدہ ہو کر اپنی رہائش الگ کر لیتے ہیں، والدین کی خدمت معاشرہ میں چند رسمی باتوں تک محدود رہ جاتی ہے، بلکہ اب تو اس طرح کے حالات آہستہ آہستہ ہندو پاک میں بھی خاص کر شہروں میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں، غرض یہ کہ اولاد کی دنیا ہی الگ ہو جاتی ہے۔

بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب باپ کاروبار سے علیحدہ ہو کر ریٹائرڈ زندگی گذارنے لگے، یا باپ کا انتقال ہو جائے اور بیوہ ماں بوجھ بن کر زندگی گذارنے پر مجبور ہو، ایسے حالات میں یہ بات عام طور پر دیکھی جا رہی ہے کہ اولاد باپ کے انتقال کے بعد دیگر املاکِ منقولہ وغیر منقولہ کے ساتھ ساتھ رہائشی مکان کو بھی تقسیم کرنے پر اصرار کرتی ہے، اور اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتی کہ ماں کی زندگی تک رہائشی مکان ماں کے قبضہ و تصرف میں رہنے دے، عام طور پر جو مکانات غریب یا متوسط طبقہ کے پاس ہوتے ہیں، ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ ۱/۸ حصہ ماں کو رہائش کے لئے کافی ہو، نتیجتاً اولاد کے اصرار پر مکان فروخت ہوتا ہے، اور مکان کی قیمت کا ۱/۸ حصہ جو ماں کو ملتا ہے، وہ اسے متبادل رہائش فراہم کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، بسا اوقات (خاص کر اگر اولاد مرحوم شوہر کی دوسری بیوی سے ہو) بیوہ کو اپنے گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہے، ایسے بھی واقعات پیش آتے ہیں کہ اپنی اولاد نے ماں کو گھر سے نکال دیا اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ ماں کو تنگ کیا جاتا ہے، بہو کی طرف سے اسے ذہنی اذیت پہنچائی جاتی ہے، اس کی عزت نفس (Dignity) مجروح ہوتی ہے، اور جس گھر میں وہ کبھی مالک مختار تھی، اسے وہاں سے خادمہ کی

= کے مختلف علماء، اور اصحاب افتاء کے پاس ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے بھجوایا کہ "مسئلہ زیر بحث میں پہلا مقدمہ جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کا اس مشکل صورت حال سے دوچار ہونا ہے جس پر تمام ہی علماء اور دوسرے اصحاب نظر کا اتفاق ہے، ہبہ اور وصیت مسئلہ کا حل نہیں۔ "عمری" مطابق فقہ مالکی مسئلہ کا حل ہے، مسئلہ مجتہد فیہ ہے، سوال یہ ہے کہ اس مشکل صورت حال اور معاشرہ کو اس تکلیف سے نجات دلانے کے لئے "فقہ مالکی" کو معمول بنانا درست ہوگا یا نہیں؟"، اس کے جواب میں بہت سی تحریریں آئیں، ان میں سے بعض تائیدی تھیں اور بعض میں اس موضوع کے نئے گوشے کھولے گئے ہیں، ان میں سے صرف ایک تحریر جو نہایت اہم اور قیمتی ہے حضرت قاضی صاحبؒ کی تحریر کے ساتھ ہی پیش کی جا رہی ہے۔

حیثیت سے زندہ رہنا قبول کرنا پڑتا ہے، خاندانی رشتہ کے کمزور ہوجانے کے باعث وہ اپنے میکہ (والدین کے گھر جہاں اب اس کے بھائیوں کا راج ہے) میں بھی اپنے لئے گنجائش نہیں پاتی اور نہ وہ بھائی کے گھر جاکر اپنی زندگی باعزت طور پر گذار سکتی ہے۔

جنوبی افریقہ اور اس جیسے دیگر ممالک میں تقریباً ہر طبقہ میں یہ شدید احساس پایا جاتا ہے کہ اس شکل کا کوئی ایسا شرعی حل نکلنا چاہئے جس کے ذریعہ اس کا اطمینان ہو کہ بیوہ خاتون باعزت زندگی گذار سکے گی اور ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی کا کیا ہوگا، اور کم از کم اس کی رہائش کا قابل اعتماد نظم اس کی زندگی میں ہونا چاہئے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کو کوئی گھر سے نہ نکال دے۔

پہلا امکانی حل ہبہ (Gift)

اس دشواری کے حل کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ شوہر رہائشی مکان بیوی کو ہبہ کردے یا اس کی آئندہ گذر اوقات کے لئے کوئی ایسی جائداد غیر منقولہ اس کو عطا کردے جس کی آمدنی اس کی کفالت کے لئے کام آئے، لیکن اس میں دو دشواریاں ہیں:

پہلی تو یہ کہ جنوبی افریقہ کے قانون کی رو سے جائداد غیر منقولہ کا ہبہ زبانی معتبر نہیں، اور اگر رجسٹرڈ وثیقہ کے ذریعہ اس جائداد غیر منقولہ کی ملکیت زوجہ کی طرف منتقل کی جائے تو اس میں اخراجات غیر معمولی ہیں، جن کا برداشت کرنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں، رجسٹریشن کے اخراجات کے علاوہ ۱۵ / فیصد مالیت شئ موہوبہ کا سرکار کو بطور عطیہ ٹیکس دینا پڑتا ہے، دوسری بڑی دشواری یہ ہے کہ اگر ہبہ کے بعد بیوی کا انتقال شوہر کی حیات میں ہوجائے تو پھر خود اس بوڑھے شوہر کو بیوی کے وارثوں کی طرف سے اسی برتاؤ سے دوچار ہونا پڑے گا، جس سے بچانے کے لئے اس نے وہ جائداد بیوی کو ہبہ کیا تھا، اپنے بیٹوں سے بھی یہ امید نہیں کی جاتی ہے کہ وہ باپ کی زندگی تک اس جائداد کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کریں گے، چہ جائیکہ اگر مرحومہ نے دوسرے شوہر سے اولاد چھوڑی ہو، یا کوئی اولاد نہیں ہونے کے باعث اس کے والدین اور بھائی یا دیگر عصبات، مال متروکہ میں حصہ پانے کے مستحق ہوں، ایسی حالت میں اس شخص کا اپنے ہی گھر سے جو اس نے بیوی کو دے دیا تھا، نکالا جانا یقینی ہوجاتا ہے۔

دوسرا راستہ وصیت

جنوبی افریقہ کے قانون کے اعتبار سے "وصیت" معتبر ہے، اور قانونی وصیت کی صحت اور اس کے مفاد کے لئے نہ ایک تہائی (۱/۳) کی تحدید ہے اور نہ "غیر وارث" کی قید، اس لئے قانونی طور پر شوہر بیوی کے حق میں رہائشی مکان یا کسی دوسری جائداد کی وصیت کرسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ شرعاً بیوی کے حق میں جو اس کی وارث ہوگی، وصیت معتبر نہیں ہوگی، اور اگر وصیت ایک تہائی سے زیادہ کی ہو تو اس وجہ سے بھی شرعاً یہ وصیت ۱/۳ سے زیادہ جائداد میں معتبر نہ ہوگی، وارث کے حق میں وصیت کا جائز نہیں ہونا اجماعی مسئلہ ہے، جس پر نص حدیث "..... فلا وصية لوارث" (۱) دلیل ہے، لہذا "وصیت" اس دشواری کا حل نہیں ہوسکتی۔

تیسرا راستہ "تاحیات ہبہ"

تیسری صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی کو اس کی حیات تک کے لئے مکان "ہبہ" کردے، اس طرح کے معاملہ کا تذکرہ احادیث وکتب فقہ میں "عمریٰ" اور "رقبیٰ" کے عنوان کے تحت آتا ہے۔

امام کاسانی لکھتے ہیں: "اگر کوئی شخص کہے: "اعمرتک هذه الدار" تمہارے لئے مکان میں نے عمریٰ کیا، یا صراحۃً یوں کہے: "یہ مکان میں نے تجھے اپنی زندگی تک کے لئے دیا" یا کہے: "تجھے یہ مکان میں نے تیری زندگی تک کے لئے دیا" یا یہ کہے: "یہ مکان تیری زندگی تک تیرا ہے، جب تو مرجائے تو یہ مجھے واپس مل جائے گا" یا یوں کہے: "یہ مکان تجھے اپنی عمر یا اپنی زندگی بھر کے لئے دیتا ہوں ..... یہ ساری صورتیں "ہبہ" کی ہیں اور یہ مکان اس شخص کی ملک ہوجائے گا جسے زندگی تک کے لئے دیا گیا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد (واہب یا اس کے وارثوں کی طرف نہیں لوٹے گا بلکہ) اسی موہوب لہ کے وارثوں کی ملکیت ہوگا اور واہب کی طرف سے وقت اور مدت کا معین کرنا باطل ہوجائے گا (۲)۔

---

(۱) سنن الترمذی ۴/ ۴۳۳ طبع استنبول۔

(۲) بدائع الصنائع للکاسانی، کتاب الہبہ ۶/ ۱۷۶۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس صورت میں جبکہ ہبہ کرنے والا اس ہبہ کو اپنی یا موہوب لہ کی مدت تک محدود کرتا ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ ہبہ نافذ ہوگا اور وقت کی تعیین باطل ہو جائے گی، امام کاسانیؒ اس کی علت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ توقیت اس میں باطل ہو جائے گی کہ واہب کا یہ کہنا کہ یہ مکان میں نے تیرے لئے قرار دے دیا، یا یہ مکان تیرا ہے، اس کا مفاد یہ ہے کہ واہب نے فوری طور پر اس مکان کی ملکیت موہوب لہ کی طرف علی الاطلاق منتقل کر دی، پھر اس کا یہ کہنا کہ ''میری زندگی یا تیری زندگی تک کے لئے'' ایسا اضافہ ہے جس کا مفاد اس انتقال ملک کو وقت کے ساتھ مقید کرنا (Limitation of Time) ہے جس کا نتیجہ عقد ہبہ (Gift Contract) کے تقاضہ کو تبدیل کرنا ہے اور اسی طرح از روئے نص تملیک اعیان (کسی شئی کی ملکیت منتقل کرنا) موقت (Time Bound) نہیں ہو سکتی، جیسے ''مبیع''، پس ہبہ کو وقت کے ساتھ پابند کرنا ایسا تصرف (Disposal) ہے جو مقتضی عقد اور شرع کے خلاف ہے، اس لئے یہ شرط باطل ہوگی اور عقد صحیح رہے گا(۱)۔

دوسری صورت رقبیٰ کی ہے، اس کا مفاد یہ ہے کہ ملکیت فوری طور پر منتقل نہیں کی جاتی، بلکہ انتقال ملک کو ایک خاص شرط کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے: ''ارقبتک ھذہ الدار وجعلت ھذہ الدار لک رقبي'' یعنی اگر میں تجھ سے پہلے مر جاؤں تو یہ مکان تیری ملک ہوگا اور اگر تو مجھ سے پہلے مر جائے تو یہ میری ملک ہے(۲)۔

یعنی رقبہ کی صورت میں اصل انتقال ملک کو ہی ایک ایسی شرط پر معلق کر دیا گیا ہے، جس کا ہونا نہ ہونا محتمل ہے، لیکن عمریٰ میں ملک فوری طور پر منتقل کر دی جاتی ہے، مگر اس کے امتداد کو خاص مدت تک محدود کر دیا جاتا ہے، پہلی صورت میں چونکہ اصل تملیک کو ایک محتمل شرط کے ساتھ مقید کر دیا جاتا ہے، اس لئے رقبیٰ فریق ثانی کے لئے مفید ملک نہ ہوگا۔ ''والتملکات مما لا یحتمل التعلیق بالخطر'' (۳) اور عمریٰ کی صورت میں ملک فوری طور پر فریق ثانی (موہوب لہ) کی طرف

(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۷۶۔
(۲) بدائع الصنائع ۶/۱۷۶۔
(۳) بدائع الصنائع ۶/۱۷۷۔

منتقل ہو جائے گی اور فریق ثانی کی موت کے بعد واپسی کی شرط کالعدم ہو جائے گی، اور دائمی ملکیت موہوب لہ کو حاصل ہو جائے گی، اور اس کی موت کے بعد جائداد موہوبہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگی، البتہ رقبیٰ کی صورت میں اگر شئی موہوب فریق ثانی کے قبضہ میں دے دی تو اسے عاریت قرار دیا جائے گا، فریق ثانی کو اس سے انتفاع کا حق حاصل ہوگا، اور فریق اول کو حق ہوگا جب چاہے واپس لے لے اور فریق اول کی موت کی صورت میں یہ اس کا متروکہ مال قرار پا کر اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا، ایک اور صورت ہے کہ صرف حق رہائش (Right of Residence) منتقل کیا جائے اور یوں کہے کہ اس مکان کا حق رہائش میں نے تجھے زندگی بھر کے لئے دیا، اس صورت میں ملک رقبہ منتقل نہیں کیا جاتا بلکہ صرف حق انتفاع منتقل کیا جاتا ہے اور بلاعوض حق انتفاع دینا عاریت ہے، اس لئے اس صورت میں بھی فریق اول جب چاہے مکان واپس کر سکتا ہے، اس کی موت کے بعد یہ مکان اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

ان ساری بحثوں کا حاصل یہ ہے:

(۱) عمریٰ: واہب کا کوئی شئی کسی کو ہبہ کر دینا اور اپنی یا اس کی زندگی تک اسے محدود کر دینا حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، اور اس صورت میں ہمیشہ کے لئے اس شئی کی ملکیت موہوب لہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور تاعمر یا تاحین حیات کی شرط باطل ہو جاتی ہے۔

(۲) رقبیٰ: جس میں انتقال ملک نہیں ہوتا، محض بطور عاریت حق انتفاع فریق ثانی کو حاصل ہوتا ہے۔

(۳) سکنیٰ: یعنی حق رہائش سے انتفاع (Right of Residence) فریق ثانی کو دینا یہ بھی عاریت کے حکم میں ہے۔

پس زیر بحث مسئلہ میں رقبیٰ اور سکنیٰ کی صورت میں اگر کوئی شخص اپنا رہائشی مکان اپنی بیوی کو دیتا ہے تو یہ محض عاریت ہوگا اور شوہر کی موت کے بعد اس کے وارثوں کو حق ہوگا کہ وہ مکان عورت سے واپس لے لیں اور ۸/۱ حصہ پر عورت کو اکتفا کرنا پڑے، یعنی یہ موجودہ دشواری کا حل نہیں ہے، اور عمریٰ کی صورت میں عورت کو حق ملکیت حاصل ہو جائے گی اور اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا، لیکن جیسا کہ ہبہ کی صورت میں بتایا گیا اگر بیوی کی وفات شوہر کی زندگی میں ہو گئی تو یہ شئی بیوی کے

وارثوں میں منتقل ہوجائے گی، اور شوہر کو انہیں دشواریوں سے گزرنا پڑ سکتا ہے، جن سے دوچار ہونے کا خطرہ بیوی کو تھا، عمریٰ کے بارے میں آئندہ ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں مختلف ائمہ مجتہدین کی رائے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن قدامہ الحنبلیؒ نے المغنی میں لکھا ہے: ''عمریٰ اور رقبیٰ، ہبہ کی دو قسمیں ہیں، اور ان ہر دو صورتوں میں بھی ہبہ کی عام صورتوں کی طرح ایجاب وقبول، قبضہ یا قبضہ کے قائم مقام کوئی عمل (جن کے نزدیک اس کا اعتبار ہے) ضروری ہے(۱)۔

عمریٰ کی صورت یہ ہے کہ ہر کوئی شخص دوسرے سے کہے: ''أعمرتک داري هذه'' (تجھے تاحین حیات میں نے اپنا یہ مکان دے دیا) یا یہ کہے: ''یہ مکان تیرا ہے میری زندگی بھر'' یا جب تک تو زندہ رہے'' وغیرہ(۲)۔

اور رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے: ''أرقبتک هذه الدار'' یا یہ کہے: ''یہ مکان تیرا ہے تیری زندگی تک اس طرح کہ اگر تو مجھ سے پہلے مرجائے تو مکان مجھے واپس مل جائے گا اور میں تجھ سے پہلے مرجاؤں تو یہ مکان تیرا اور تیرے وارثوں کا ہوگا'' گویا وہ یوں کہتا ہے کہ یہ مکان اس شخص کا ہوگا جو بعد کو وفات پائے، اور دونوں ہی صورتیں اکثر اہل علم کی رائے میں جائز ہیں، اور بعضوں سے ایسا نقل کیا گیا کہ یہ صحیح نہیں ہے(۳)۔

عمریٰ (حین حیاتی ہبہ) کی وجہ سے ملک معمِر (دینے والے) سے معمَر (جسے دیا گیا ہے) کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، یہ قول حضرت جابر بن عبداللہؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، شریحؒ، مجاہدؒ، طاؤسؒ، ثوریؒ، شافعیؒ اور اصحاب رائےؒ (امام ابوحنیفہؒ) کا ہے، امام مالکؒ اور لیثؒ کا کہنا ہے کہ عمریٰ: شئ موہوب کی نہیں بلکہ اس کے منافع کی تملیک ہے، لہٰذا موہوب لہ (معمَر) کو مکان کے استعمال اور

(۱) "العمری والرقبی نوعان من الهبة یفتقران إلی ما یفتقر إلیه سائر الهبات من الإیجاب والقبول والقبض أو ما یقوم مقام ذلک عند من اعتبره" (المغنی ۶/ ۳۳۴ طبع دار الفکر)۔
(۲) حوالہ سابق ۶/ ۳۳۴، ۳۳۵۔
(۳) المغنی لابن قدامہ ۶/ ۳۳۵۔

اس میں رہائش کا حق حاصل ہوجائے گا، اور جب موہوب لہ مرجائے گا تو واہب (معمِر) کی طرف وہ ''شئ موہوب'' لوٹ جائے گی(۱)۔

الشرح الکبیر علی متن المقنع میں لکھا ہے: ''اگر ہبہ کرنے والے نے یہ شرط لگادی کہ موہوب لہ کے مرنے کے بعد یہ شئ موہوب، ہبہ کرنے والے یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی تو اس شرط کی صحت کے بارے میں دو رائیں ہیں، ایک تو یہ کہ عقد اور شرط دونوں صحیح ہیں، اور جب موہوب لہ مرجائے گا تو یہ شئ واہب کی طرف لوٹ جائے گی، یہی قول قاسم بن محمد، یزید بن قسیط، امام زہری، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، ابن ابی ذئب، امام مالک، امام ابوثور اور داؤد کا ہے، اور امام شافعیؒ کا بھی یہی ایک قول ہے: ''لما روى جابر قال إنما العمري التي أجاز رسول الله ﷺ أن يقول هي لک ولعقبک، فأما إذا قال هي لک ما عشت فإنها ترجع إلى صاحبها''(۲)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شئ موہوب لہ کی ملک ہوجائے گی، نیز اس کے وارثوں کی، اور شرط باطل ہوجائے گی، امام شافعیؒ کا قول جدید اور امام ابوحنیفہ کا مسلک یہی ہے اور مذہب حنبلی میں بھی ظاہر مذہب یہی ہے(۳)۔

پس معلوم ہوا کہ حنفیہ، حنابلہ اور امام شافعیؒ کے قول جدید کی رو سے شئ موہوب بصورت عمریٰ واہب کی طرف موہوب لہ کی موت کے بعد واپس نہیں ہوگی، لیکن امام مالکؒ، لیث بن سعدؒ، ابوثور اور دوسرے بعض ائمہ کے نزدیک موہوب لہ کی موت کے بعد شئ موہوب، واہب یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی۔

امام ابن رشد نے یوں لکھا ہے: ''ہبۂ منافع کی ایک قسم وہ ہے جس میں موہوب لہ کی حیات تک کی شرط ہوتی ہے، اسے عمریٰ کہا جاتا ہے، اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں، ایک

(۱) المغنی لابن قدامہ ۶/ ۳۳۶۔
(۲) صحیح البخاری ۳/ ۱۴۳ طبع استنبول، صحیح مسلم ۲/ ۱۲۴۶ طبع استنبول۔
(۳) الشرح الکبیر علی متن المقنع لابن قدامہ ۶/ ۲۸۹، ۲۹۰۔

قول تو یہ ہے کہ یہ قطعی طور پر ہبہ ہے، اور شئ موہوب کی ملکیت موہوب لہ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، یہ قول امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام ثوریؒ اور امام احمد بن حنبلؒ، نیز دیگر علماء کا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس صورت میں موہوب لہ کو (ملک رقبہ نہیں) بلکہ صرف منافع کی ملک حاصل ہوتی ہے، پس جب ''موہوب لہ'' مرجائے تو شئ موہوب ''واہب'' کی طرف یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی اور یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے(۱)۔

اور فقہ مالکی کی کتاب ''رسالہ ابن ابی زید القیر وانی'' میں ہے: "من عمر رجلا حياته دارا رجعت بعد موت الساكن ملكا لربها، فإن مات المعمر يومئذ كانت لورثته يوم موته ملكا" (۲) (کسی شخص نے کسی شخص کو بطور ''عمریٰ'' اس کی زندگی بھر کے لئے مکان دے دیا تو اس شخص کی موت کے بعد وہ مکان واہب کی طرف اس کے مملوک ہونے کی حیثیت سے واپس ہوجائے گا، پس اگر واہب کی موت عمریٰ کرنے کے بعد ہوگئی تو موہوب لہ کی موت کے بعد یہ شئ ان لوگوں کی ملک قرار پائے گی جو واہب کی موت کے دن ان کے وارث تھے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق اگر شوہر اپنا رہائشی مکان اپنی زندگی میں بیوی کو حین حیات ہبہ کردے یعنی یہ کہہ دے کہ یہ مکان میں نے تمہاری زندگی تک کے لئے دیا تو ایسی صورت میں شوہر کی موت کے بعد بھی وہ عورت جب تک زندہ رہے گی، اسے اس مکان میں رہائش کا حق ہوگا، اور شوہر کے وارثوں کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ وہ اس مکان کی تقسیم کرکے اپنی وراثت وصول کرلیں، ہاں اس عورت کی وفات کے بعد (اگر شوہر زندہ ہو تو اس کی طرف، ورنہ) شوہر کے وارثوں کی طرف وہ مکان لوٹ جائے گا، اور وراثت ان لوگوں میں جاری ہوگی جو شوہر کی وفات کے دن اس کے وارث تھے۔

(۱) بدایۃ المجتہد ۲/۲۲۸۔
(۲) الثمر الدانی فی تقریب المعانی فی شرح رسالۃ ابن أبی زید القیر وانی/۵۵۸۔

مسئلہ مجتہد فیہ ہے

مذکورالصدر تفصیلی بحث اور ائمہ مجتہدین کے مسالک کے جائزے سے یہ امر واضح ہوگیا کہ حین حیاتی ہبہ جائز ہے اور موہوب لہ کی موت کے بعد واہب یا اس کے وارثوں کی طرف اس کی ملکیت کا واپس ہوجانا ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے، جس میں دلائل متعارض ہیں، اور اس کی وجہ سے ائمہ کی آرا مختلف ہیں۔

منصوص اور مجتہد فیہ میں فرق

اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ احکام منصوصہ اور احکام مجتہد فیہا کے مدارج مختلف ہیں، احکام منصوصہ سے عدول کسی حال میں جائز نہیں، لیکن احکام مجتہد فیہا میں خاص شرائط کے ساتھ بوقت ضرورت عدول جائز ہوگا۔

حالات کی تبدیلی کا اثر احکام پر

واضح رہے کہ شرع کے کچھ کلی قواعد ہیں جو تشریع کی بنیاد ہیں، ان کی رعایت بہرحال ضروری ہے، مثلاً شرع میں تخفیف وتیسیر، دفع ضرر اور دفع فساد کا اعتبار کیا گیا ہے "الدين يسر، الحرج مدفوع، الضرر يزال، إذا ضاق الأمر اتسع" (۱) ایسے قواعد ہیں جن کی رعایت احکام کے تعین کے وقت ضروری ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے: "فكثير من الأحكام يختلف باختلاف الزمان لتغير (عرف) أهله أو لحدوث ضرورة أو فساد أهل الزمان بحيث لو بقي الحكم على ما كان عليه أولا للزم منه المشقة والضرر بالناس ولخالف القواعد الشرعية المبنية على التخفيف والتيسير ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم على أتم نظام

(۱) الأشباہ والنظائر لابن نجیم۔

وأحسن أحكام، ولهذا نرى مشائخ المذهب خالفوا مانص عليه المجتهد في مواضع كثيرة بناء على ما في زمنهم لعلمهم بأنه لو كان في زمنهم لقال بما قالوا به أخذاً من قواعد مذهبه"(۱)۔

اوران سارے قواعد کی بنیاد آیات قرآنی پر ہے، مثلاً کوئی بھی نئی صورت حال ہو، فقہ اسلامی اس کا حکم کتاب وسنت سے مستنبط کرے گی، اس لئے کہ دین کامل ہو چکا، اور کمال دین کا تقاضا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے قضایا اور حوادث کا حل اس میں موجود ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"(۲)، دوسری طرف یہ بھی فرمایا: "مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ"(۳)، "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ"(۴)، "يُرِيْدُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا"(۵)۔

ان ہی آیات سے فقہاء نے یہ قواعد مستنبط کیے ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اور شامی کی تصریح کے مطابق عرف کی تبدیلی، ضرورت کا پیدا ہو جانا اور اہل زمانہ میں فساد کا پیدا ہو جانا، جس کی وجہ سے حکم معروف پر عمل میں مشقت پیدا ہو جائے اور لوگوں کو ضرر پہنچے تو شرع کے عمومی قواعد کے پیش نظر آسانی پیدا کرنے اور ضرر وفساد کو دور کرنے کے لئے احکام میں تبدیلی ہوگی، اسی لئے مشائخ مذہب نے بسا اوقات مجتہد کی تصریحات کے خلاف فتویٰ دیا ہے، اور ہر حکم کی یہ تبدیلی دلائل وبراہین کی ایک دوسرے پر ترجیح پر مبنی نہیں، بلکہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی پر اس کی اساس ہے، کہ اگر موجودہ صورت حال اس زمانہ میں موجود ہوتی تو وہ مجتہدین بھی یہی رائے دیتے، اس طرح کے فتاویٰ کی بے شمار نظیریں فقہ کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

---

(۱) رسائل ابن عابدین ۱۲۶/۔
(۲) سورۂ مائدہ ۳/، (آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کیا)۔
(۳) سورۂ حج ۷۸/، (اللہ تعالیٰ نے دین کے مقابلہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی)۔
(۴) سورۂ بقرہ ۱۸۵/، (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا)۔
(۵) سورۂ نساء ۲۸/، (اللہ تم سے بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے اور انسان کو تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے)۔

ماضی قریب میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ان بزرگوں میں سے گزرے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے فقہ میں درک وبصیرت کے ساتھ ساتھ زمانہ شناسی، اپنے عہد کے حالات سے واقفیت، معاملات ناس سے باخبری کی دولت بے بہا عطا فرمائی تھی، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: "یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ کو بھی حلال کہا جائے، نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے، اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہئے، جائز تک رکھے تو غنیمت ہے ...... پر کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔

اختلافی مسائل میں اگر ابتلاء عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت میں وسعت ہے اور (آج کل) معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں، اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جائے گا تو اگر اس پر کوئی عمل کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا، اس لئے تنگی میں غلو نہیں کرنا چاہیے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا، کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے"(۱)۔

اور حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان فرماتے ہیں: "چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے حضرت تھانویؒ کو وصیت کی تھی اور حضرت تھانویؒ نے ہم سے فرمایا کہ آج کل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کے شکار ہیں، اس لئے خاص طور سے بیع وشرا اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذہب میں عام لوگوں کے لئے گنجائش کا پہلو ہو، اس کو فتویٰ کے لئے اختیار کرنا چاہئے"(۲)۔

بہر حال اگر ضرورت داعی ہے اور زمانہ کے بگاڑ کی وجہ سے عام مسلم معاشرہ دشواری میں مبتلا ہے اور اس دشواری کا حل ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول میں موجود ہو تو ایک امام کے قول سے

---

(۱) التبلیغ ۱۵/ ۶۷، ۷۹، ۸۲۔
(۲) البلاغ مفتی اعظم نمبر ا۔

دوسرے امام کے قول کی طرف مقلدین کے لئے عدول کرنا اور اس پر فتویٰ دینا جائز ہی نہیں بلکہ عین مقتضائے قول شرعی ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے بارے میں ٹرانسوال اور نٹال کے بہت سے ممتاز علماء، قانون دانوں، سماجی کارکنوں اور اہل دانش سے میری باتیں ہوئیں، یہ سبھی حضرات صورت حال کی نزاکت، معاشرہ کی دشواریوں سے متعلق اور اس مسئلہ میں لوگوں کے عام ابتلاء پر اتفاق رکھتے ہیں اور طرح طرح کی ترکیبیں اس شکل سے نکلنے کی سوچتے رہتے ہیں، یا پھر عوام الناس سرکاری قانون کے مطابق اپنی بیوی کے حق میں وصیت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جو شرعی نادرست اور خلاف نص واجماع ہے۔

ان حالات میں اس حقیر کے نزدیک معاشرہ کو اس شدید مشقت اور مشکل ودشوار گذار حالات سے نکالنے کے لئے اس ابتلاء عام کی صورت میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دینا جائز ہوگا کہ ''شوہر رہائشی مکان بیوی کو اس شرط کے ساتھ دے دے کہ یہ مکان بیوی کی زندگی بھر اس کے قبضے وتصرف میں رہے گا اور وہ اس سے مستفید ہوتی رہے گی، اور اس کی موت کے بعد اگر خود شوہر زندہ ہو تو وہ مکان اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اگر وہ بیوی کی وفات سے پہلے مر جائے تو شوہر کے وارثوں میں جو اس کی وفات کے وقت موجود تھے بطور متروکہ بحساب سہام شرعی تقسیم ہو جائے گا۔

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ:

۱-عمریٰ (حین حیاتی ہبہ) جس کی رو سے کوئی شوہر اپنی زوجہ کو اس کی زندگی بھر کے لئے کوئی شی مثلاً رہائشی مکان دے کے جائے۔

۲-موہوب لہا (زوجہ) اپنی زندگی بھر جس طرح چاہے ''شی موہوب'' سے منتفع ہوتی رہے گی، خود شوہر کو یا اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو اس پر حق اعتراض نہیں ہوگا، لیکن زوجہ اس مکان کو فروخت نہیں کر سکتی۔

۳-اگر زوجہ (موہوب لہا) شوہر کی زندگی میں فوت کر جائے تو یہ شی موہوب شوہر کو واپس

مل جائے گی اور زوجہ کے وارثوں کو اس پر کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

۴-اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو زوجہ (موہوب لہا) جب تک زندہ ہے، شوہر کے وارثوں کو اس شی موہوب پر کوئی حق انتفاع حاصل نہیں ہوگا، اور نہ وہ اسے فروخت کر سکتے ہیں، نہ کوئی اور تصرف کر سکتے ہیں۔

۵-زوجہ کے انتقال کے بعد یہ شی موہوب زوج کے ان وارثوں میں تقسیم ہوگی جو بوقت وفات زوج اس کے وارث تھے، اگر ان میں سے کوئی وارث درمیانی مدت میں انتقال کر گیا ہو تو اس کا شرعی حصہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆

مخدوم ومکرم جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کو درپیش ایک سماجی مشکل کو حل کرنے سے متعلق آپ کی تحریر موصول ہوئی، آپ کی تحریر کو غور سے پڑھنے اور کتب فقہ اسلامی کی جانب مراجعت کے بعد اپنے خیالات ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱- جنوبی افریقہ اور دیگر مغرب زدہ ممالک میں متنوع معاشرتی پیچیدگیوں کا پیدا ہونا حیرت انگیز نہیں ہے، کوئی سماج جب فطری سادگی اور بنیادی انسانی اقدار سے دور ہو جاتا ہے تو غیر فطری اور مصنوعی تہذیب ومعاشرت کے نتیجے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، ان حالات میں علماء، ارباب اصلاح اور اصحاب فقہ وافتاء کی دوہری ذمہ داری ہوتی ہے، پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ سماج کو فطری سادگی اور بنیادی انسانی اقدار کی طرف واپس لانے کی انتھک کوشش کی جائے، سماج کا وہ روگ دور کرنے کی پوری سعی کی جائے، جس کے نتیجے میں طرح طرح کی پیچیدگیاں جنم لے رہی ہیں اور معاشرہ نت نئی الجھنوں میں پھنستا جا رہا ہے، خونی اور خاندانی رشتے کا اتنا کمزور ہو جانا کہ بیٹوں کو ماں باپ کی بنیادی ضروریات کا خیال نہ ہو، اور بعض حالات میں اولاد کے موجود ہوتے ہوئے بیوہ ماں کو در در کی ٹھوکریں کھانا پڑے، بڑے خطرے کی علامت ہے،

خاندانی نظام کا بکھراؤ کسی سماج کے لئے اچھی علامت نہیں ہے، اس بارے میں جنوبی افریقہ کے علماء، مصلحین اور اصحاب دانش کو جنگی پیمانے پر جد وجہد کرنی چاہئے، خدا کرے اس سلسلے میں جنوبی افریقہ کے علماء اور مصلحین فکر مند اور سر گرم عمل ہوں۔

دوسری ذمہ داری جو خصوصاً علماء اور اصحاب افتاء پر عائد ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی اور اسلامی اقدار سے منحرف سماج میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کا حل تلاش کریں اور جب تک کہ سماج کی اصلاح نہیں ہو جاتی اس وقت تک کے لئے دفع مضرت، رفع حرج وغیرہ کے اصولوں کی روشنی میں مشکلات سے کراہتے ہوئے سماج کے لئے یسر وسہولت پیدا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو کامیاب اور قبول کرے کہ آپ نے جنوبی افریقہ کے علماء اور اصحاب دانش کی تحریک پر اس سلسلے میں پہل کی اور شریعت مطہرہ کی روشنی میں ایک پیچیدہ سماجی مسئلہ کو حل کرنے کی سعی فرمائی۔

۲- جنوبی افریقہ کی بیوہ عورتوں کو رہائشی مکان کی جو دشواری پیش آتی ہے، اس کی حیثیت شاذ ونادر واقعات کی ہے یا اس نے ایک سماجی مشکل کی صورت اختیار کر لی ہے، یعنی ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں، اس کے بارے میں جنوبی افریقہ کے علماء اور متدین افراد ہی کا بیان فیصلہ کن مانا جائے گا، آپ نے تحریر فرمایا ہے ''مسئلہ زیر بحث میں پہلا مقدمہ جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کا اس مشکل صورت حال سے دوچار ہونا ہے، اس پر تمام ہی علماء اور دوسرے اصحاب نظر کا اتفاق ہے'' میرے خیال میں آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جانا اور جنوبی افریقہ کے معتد بہ علماء کا اس کے بارے میں فکر مند ہونا اور غور وخوض کرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ مسئلہ سماجی مسئلہ بن چکا ہے اور اس سطح پر آ گیا ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس کا کوئی حل تلاش کرنا اصحاب افتاء کی ذمہ داری ہے، فقہ حنفی کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر اس مشکل کا حل ممکن نہ ہو تو خود حنفی اصول افتاء کی روشنی میں ضروری ہے کہ دوسرے فقہاء اسلام کے اقوال ومذاہب میں اس کا حل تلاش کیا جائے۔

۳- مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہبہ اور وصیت اس مشکل کا حل نہیں ہیں اور ان دونوں کو

اختیار کرنے میں شرعی قباحت یا عملی دشواری ہے۔

۴- آپ کی رائے میں فقہ مالکی کے مطابق عمری (تاحیات ہبہ) اس مسئلے کا حل ہے، مجھے بھی آپ کی رائے سے بڑی حد تک اتفاق ہے، اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ فقہ مالکی کے مطابق عمری کو اختیار کر لینے میں اگر یہ مشکل حل ہو جاتی ہو تو خود حنفی اصول افتاء کا تقاضا ہے کہ فقہ مالکی کو اس خاص مسئلہ میں اختیار کر لیا جائے، لیکن اس سلسلے میں میری چند معروضات ہیں ان پر غور کیا جائے، تاکہ پوری تنقیح وبصیرت کے ساتھ زیر بحث مسئلہ میں فیصلہ کیا جا سکے۔

(الف) یہ بات محتاج بیان نہیں کہ فقہ مالکی سے اگر عمریٰ کا مسئلہ اختیار کیا جائے تو فقہ مالکی کی شرائط وتفصیلات کے ساتھ اختیار کیا جائے گا، فقہ مالکی کے مطابق عمریٰ ہبہ ہی کی ایک قسم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عمری عین مال کے بجائے منافع مال کا ہبہ ہے، اسی لئے کتب مالکیہ میں عمری کو ہبہ کی ایک قسم ہی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد جلد ثانی، کتاب الہبات۔

جب عمری ہبہ کی ایک قسم ہے تو اس میں وہی تمام شرطیں ملحوظ ہوں گی جن کا ہبہ میں وجود ضروری ہے، علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے: "والعمرى والرقبى نوعان من الهبة يفتقران إلى ما يفتقر إليه سائر الهبات من الإيجاب والقبول والقبض أو ما يقوم مقام ذلك عند من اعتبره" (۱) (عمری اور رقبی ہبہ کی دو قسمیں ہیں، ان دونوں میں ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی تمام ہبات میں ضرورت ہوتی ہے یعنی ایجاب وقبول اور قبضہ یا قبضہ کے قائم مقام کوئی چیز، ان کے نزدیک جو اسے معتبر مانتے ہیں)۔

مالکیہ کے نزدیک قبضہ اگرچہ صحت ہبہ اور لزوم ہبہ کے لئے شرط نہیں لیکن تمامیت ہبہ کے لئے شرط ہے، علامہ ابن رشد ائمہ کے اقوال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "إن العلماء اختلفوا هل القبض شرط في صحة العقد أم لا؟ فاتفق الثوري والشافعي وأبو حنيفة أن من شرط صحة الهبة القبض وأنه إذا لم يقبض لم يلزم الواهب، وقال مالك: ينعقد بالقول ويجبر على القبض كالبيع سواء، فإن تأني الموهوب له عن طلب

(۱) المغنی ۶/ ۳۰۲۔

القبض حتى أفلس الواهب أو مرض بطلت الهبة" (۱) (علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا قبضہ عقد ہبہ کی صحت کے لئے شرط ہے یا نہیں؟ ثوری، شافعی، ابوحنیفہ کا اتفاق ہے کہ صحت ہبہ کی ایک شرط قبضہ ہے اور اگر قبضہ نہیں کیا تو ہبہ کرنے والے کے ذمہ ہبہ لازم نہیں ہوا، مالک نے فرمایا: ہبہ قول سے منعقد ہو جاتا ہے اور اسے بیع کی طرح قبضہ پر مجبور کیا جائے گا، اگر موہوب لہ نے قبضہ کا مطالبہ کرنے میں سستی کی یہاں تک کہ ہبہ کرنے والا مفلس ہو گیا یا مرض الموت میں مبتلا ہو گیا تو ہبہ باطل ہو گیا)۔

احمد الدردیر مالکی الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں: "(وحيز) الشيء الموهوب ستتم الهبة أي تحصل الحيازة عن الواهب التي هي شرط في تمامها (وإن بلا إذن) من الواهب ولا يشترط التحويز ...(وبطلت) الهبة (إن تأخر) حوزها (لدين محيط)... (أو وهب لثان وحاز) ...... (أو جن) الواهب (أو مرض) بغير جنون (واتصلا بموته) "(۲) (اور ہبہ کی گئی چیز پر قبضہ کر لیا گیا، تاکہ ہبہ مکمل ہو جائے، یعنی ہبہ کرنے والے کی جانب سے قبضہ ہو جائے جو ہبہ کے مکمل ہونے کے لئے شرط ہے، اگرچہ واہب کی اجازت کے بغیر ہو، قبضہ دلانا شرط نہیں ہے، اور ہبہ باطل ہو گیا اگر اس کے قبضہ میں تاخیر ہوئی احاطہ کرنے والے دین کی وجہ سے ...... یا دوسرے کو ہبہ کر دیا اور اس نے قبضہ کر لیا یا ہبہ کرنے والے کو جنون لاحق ہو گیا یا جنون کے علاوہ مرض لاحق ہو گیا اور دونوں چیزیں اس کی وفات تک برقرار رہیں)۔

میاں بیوی میں سے اگر ایک دوسرے کو رہائشی مکان ہبہ کرتا ہے، اس سلسلے میں مالکیہ کے یہاں بڑی صراحت ملتی ہے، اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس سلسلے کی کچھ تفصیل الشرح الکبیر اور حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر سے نقل کی جاتی ہے: "(و) صح (هبة أحد الزوجين للآخر متاعا) وإن لم ترفع يد الواهب عنه للضرورة والمراد بالمتاع ماعدا دار السكنى

(۱) بدایۃ المجتہد ۲/۳۲۹۔
(۲) الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۵/۴۹۶ تا ۴۹۹ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

فيشمل الخادم وغيره وأما دار السكنى ففيها تفصيل أشار له بقوله وصحت (هبة زوجة دار سكناها لزوجها لا العكس) وهو هبة الزوج دار سكناه لزوجته فلا يصح لعدم الحوز لأن السكنى للرجل لا للمرأة فإنها تبع له" (۱) (میاں بیوی میں سے ایک کا دوسرے کو کوئی سامان ہبہ کرنا صحیح ہے، اگرچہ ہبہ کرنے والے کا قبضہ اس سے ختم نہ ہوا ہو، ضرورت کی وجہ سے اور متاع (سامان) سے مراد رہائشی مکان کے علاوہ دوسری چیزیں ہیں، لہٰذا اس میں خادم وغیرہ بھی شامل ہوں گے، رہائشی مکان کے بارے میں تفصیل ہے جس کی طرف مصنف نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے، کہ بیوی کا اپنا رہائشی مکان اپنے شوہر کو ہبہ کرنا درست ہے، اس کے برعکس درست نہیں، یعنی شوہر کا اپنا رہائشی مکان بیوی کو ہبہ کرنا درست نہیں، کیونکہ اس میں قبضہ نہیں پایا جا رہا ہے، کیونکہ رہائش مرد کی مانی جاتی ہے نہ کہ عورت کی، کیونکہ بیوی شوہر کے تابع ہے)۔

"قوله لا (العكس) وهو هبة الزوج لزوجته دار سكناه فلا يصح إذ استمر ساكنا فيها معها حتى مات" (۲) (ان کے قول "لا العکس" کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی کو اپنا رہائشی مکان ہبہ کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ شوہر اپنی وفات تک بیوی کے ہمراہ اسی مکان میں رہائش رکھے)۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب الخرشی علی مختصر سیدی خلیل جزء "۷" میں بھی اسی طرح کی تصریحات موجود ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر فقہ مالکی سے عمری کی ضروری تفصیلات مرتب کیے بغیر زیر بحث سماجی مشکل کو حل کرنے کے لئے فقہ مالکی سے عمری کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا گیا، تو اس پر جو عمل کیا جائے گا وہ فقہ مالکی کے مطابق نہیں ہوگا، عمری کی کارروائی ایک کاغذی کارروائی ہو کر رہ جائے گی، جن ممالک میں رہائشی مکانات کی شدید دشواری ہوتی ہے۔ (غالباً جنوبی افریقہ میں بھی ایسا ہو) ان میں شوہر کا بیوی کی حیات تک اپنے رہائشی مکان سے کامل طور پر دستبردار ہو جانا آسان بات نہیں ہے، کیونکہ نیا

(۱) الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۵/۵۰۴، ۵۰۵ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔
(۲) تقریرات علیش مع حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۵/۵۰۵ طبع بیروت۔

رہائشی مکان مہیا کرنا چنداں آسان نہیں، اور اگر عمری کے بعد بھی حسب دستور میاں بیوی اسی مکان میں رہتے رہے تو میرے خیال میں فقہ مالکی کے مطابق عمری کی تکمیل نہیں ہوئی، اور شوہر کے مرض الموت میں گرفتار ہوتے ہی عمری باطل ہوگیا، لہٰذا جس سماجی مشکل کا حل کرنے کے لئے فقہ مالکی سے عمری کا مسئلہ اختیار کیا جانا زیر غور ہے وہ حل نہ ہو پائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ فقہ مالکی کی مستند کتابوں سے عمری کی ضروری شرائط وتفصیلات یکجا کئے جائیں اور فتویٰ دیتے وقت ان شرائط وقیود کی بھی صراحت کردی جائے تاکہ جو لوگ بیوی کے لئے رہائشی مکان عمری کرنا چاہیں وہ ان شرائط وتفصیلات کا بھی لحاظ رکھیں، اور ان کے مطابق عمل کریں۔

(ب) اگر شوہر نے اپنا رہائشی مکان بیوی کو بطور عمری ہبہ کردیا تو ظاہر بات ہے کہ بیوی کی حیات تک (خواہ دونوں کا نکاح باقی رہے یا ختم ہوجائے) وہ مکان بیوی ہی کے قبضہ وتصرف میں رہے گا، بیوی اسے کرایہ پر بھی اٹھا سکتی ہے، کسی دوسرے کو عاریۃً رہائش کے لئے بھی دے سکتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا بیوی کے مستقبل کے لئے فکر مند شوہر اپنے رہائشی مکان سے عملاً اس حد تک بے دخلی پر آمادہ ہوں گے اور کیا ان کے لئے دوسری رہائشی مکان کی فراہمی جنوبی افریقہ جیسے ملک میں آسان ہوگی؟ بطور عمری شوہر کا مکان ملنے کے بعد ایسا ممکن تو ہے کہ شوہر کچھ دنوں کے لئے الگ رہائش کا بندوبست کرلے اور مکان موہوبہ کو مکمل طور پر بیوی کے قبض وتصرف میں دے دے، پھر کچھ دنوں کے بعد بیوی بخوشی شوہر کو اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دے، لیکن جنوبی افریقہ کا سماج جو دن بدن مغربیت کے اثر سے تعاون، ہمدردی اور صلہ رحمی کے جذبات سے عاری ہوتا جارہا ہے، وہاں کی خواتین سے کیا ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ مکان پر مکمل قبض ودخل ملنے کے بعد اسے کرایہ پر اٹھا کر جو زبردست مادی منفعت حاصل کی جاسکتی ہے اس سے وہ بخوشی دست بردار ہونے کو تیار ہوجائیں گی؟ زیادہ دشواری اس وقت پیش آئے گی جب خدانخواستہ دونوں کے تعلقات خراب ہوں گے اور طلاق کی نوبت آئے گی، ظاہر بات ہے کہ طلاق کے بعد وہ مطلقہ بیوی مکان موہوبہ کے منافع کی اسی طرح حقدار رہے گی جس طرح نکاح

کے وقت تھی، اور اس کی زندگی بھر شرعاً اسی کو قبض وتصرف حاصل رہے گا۔

میرے یہ اندیشے کس درجہ قابل لحاظ ہیں اس کا فیصلہ غالباً جنوبی افریقہ کے علماء اور اصحاب دانش، نیز وہاں کی سماجی زندگی کا تجربہ رکھنے والے افراد سے تبادلۂ خیال کے بعد ہی کیا جاسکے گا، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ فقہ مالکی سے عمری کو اختیار کرنے کے ممکنہ اثرات ونتائج کے بارے میں دوبارہ غور وخوض کیا جائے، اور اگر جنوبی افریقہ کے اصحاب فقہ ودانش اور ماہرین سماجیات اس بات پر مطمئن ہوں کہ عمری والا حل اختیار کرنے میں دوسری سنگین پیچیدگیاں جنم نہیں لیں گی تو فقہ مالکی سے عمری کا مسئلہ اختیار کرکے جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کی زیر بحث سماجی مشکل دور کردی جائے۔

کتاب الأضحیة

دم کٹی ہوئی بھیڑ کی قربانی ہوسکتی ہے؟

مخدوم ومکرم حضرت مفتی قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب

دوسوال برائے استفتاء پیش خدمت ہے، جواب مرحمت فرما کر شکر گذاری کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

ہمارے دیار میں بھیڑ ہی قربانی میں ذبح ہوتے ہیں، بکرے اور گائے کا رواج بہت کم ہے، یہاں بھیڑ کی پرورش اور کاروبار گوروں کے ہاتھ میں ہے، حفظان صحت کے پیش نظر بھیڑ کی دم چھوٹی عمر میں کاٹ دیتے ہیں، وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دم نہ کاٹنے کی صورت میں دم پاخانہ کے مقام پر چپک جاتی ہے، پھر جانور کو پاخانہ کرتے وقت تکلیف ہوتی ہے، وہاں پر یعنی پاخانہ کے مقام پر کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور وہ کلیجے اور جگر میں پہنچتے ہی وہ کلیجہ انتہائی مضر صحت ہوتا ہے اور جانور کمزور ہوجاتا ہے، ہمارے یہاں مذبح میں ذبح کے بعد ہر جانور کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے۔ اگر کلیجہ میں کیڑے پائے گئے تو اس کلیجے کو آگ کی نذر کرکے جلادیتے ہیں۔ اور وہ کیڑا اتنا جاندار ہوتا ہے کہ کھولتے ہوئے پانی میں کلیجے کو ابالا جائے تب بھی نہیں مرتا۔ اور پھر دم کاٹنے سے جس طرح خصی کرنے سے فربہ ہوتا ہے، دم کاٹنے کی صورت میں بھی جانور فربہ ہوتا ہے، دم والے جانور بھی ملتے ہیں، مگر بہت کم اور بکرے تو بہت ہی کم ملتے ہیں، اور بہت گراں۔ ان حالات میں اگر وقت پر دم بریدہ بھیڑ ہی ملیں تو اس کی قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

جب طبی تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ بھیڑ کو امراض سے بچانے کے لئے اس کی دم

کاٹ دینا ضروری ہے، ورنہ بھیڑ امراض کا شکار ہوکر نہ صرف یہ کہ انتہائی لاغر ونحیف ہوجائے گا، بلکہ اس کے گوشت کا استعمال انسانی صحت کے لئے بھی مضر ہوسکتا ہے تو ایسی صورت میں یہ دم کاٹنا، بھیڑ کو عیب دار بنانا نہیں بلکہ اس کو عیب سے بچانا ہے، اس لئے دم بریدہ بھیڑ کی قربانی جائز ودرست ہے، دم کاٹ دینے سے بھیڑ عیب دار نہیں ہوا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز عید سے قبل دی ہوئی قربانی کا حکم

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز عید الاضحیٰ کے قبل قربانی کرنا جائز ہے کہ نہیں، ہم لوگوں کے درمیان اختلاف ہے کہ بعد نماز قربانی کرنا چاہئے، قبل نماز قربانی جائز نہیں ہے، مہربانی فرماکر جواب باثواب سے مطلع فرمائیں کہ قبل نماز قربانی کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

جہاں عید الاضحیٰ کی نماز ہوتی ہے وہاں نماز سے قبل قربانی کرنا درست نہیں ہے، لیکن جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی ہے وہاں نماز سے قبل بھی قربانی کرسکتے ہیں (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) "ویضحی بالجماء والخصی والثولاء" (الدر المختار علی رد المحتار ۹/ ۴۶۷)، الفتاوی الہندیہ ۵/ ۲۹۷۔

(۲) "ووقت الأضحیة یدخل بطلوع الفجر من یوم النحر، إلا أنه لا یجوز لأهل الأمصار الذبح حتی یصلي الإمام العید، فأما أهل السواد فیذبحون بعد الفجر والأصل فیه قوله علیه السلام "من ذبح شاة قبل الصلاة فلیعد ذبیحته ....." (صحیح البخاری، کتاب الاضاحی ۹/ ۲۳۸ طبع استنبول) غیر أن هذا الشرط في حق من علیه الصلاة وهو المصري دون أهل السواد" (فتح القدیر ۹/ ۵۲۵، ۵۲۶ طبع بیروت)، رد المحتار ۹/ ۴۶۰۔

کتاب الأطعمة

خرگوش کی حلت

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں:

شریعت اسلامی میں خرگوش حلال ہے، اس کے حلال ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ اسی قبیل کے دوسرے جانور حرام قرار دیئے گئے ہیں اور جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے مندرجہ ذیل نکات خرگوش کو حلال قرار دیئے جانے کے خلاف جاتے ہیں۔

(۱) خرگوش ''بلی'' کے قبیل کا جانور ہے، (۲) جگالی نہیں کرتا، (۳) اسے حیض کا خون آتا ہے، (۴) اسے پستان بھی ہوتا ہے، (۵) پھٹے کھر نہیں ہوتے، بلکہ ناخن ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

براہ کرم قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

حلت وحرمت کا تعلق حکم الٰہی سے ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ'' (۱) (اور حلال کئے گئے تمہارے لئے چوپائے مویشی سوائے ان کے جو آگے تمہیں بتائے جارہے ہیں)۔ اور چند آیات کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ'' الخ الآية (۲) (تم پر حرام کیا گیا مردار، خون اور لحم خنزیر (وغیرہ حسب تفصیل آیت))، پس حلت وحرمت کا اصل تعلق حکم الٰہی سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام حکمت سے خالی نہیں، شریعت نے طیبات (پاک صاف چیزوں) کو

(۱) سورۂ مائدہ / ۱۔
(۲) سورۂ مائدہ / ۳۔

انسان کے لئے حلال کیا ہے، ''بهيمة الانعام'' مویشی چوپائے جو پاک صاف انسانی فطرت اور جسمانی تقاضوں کے موافق ہیں، انہیں حلال کیا گیا ہے، جہاں تک خرگوش کا تعلق ہے، اس کا حلال ہونا صریح وصحیح حدیث نبی ﷺ سے ثابت ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: ''ولا بأس بأكل الأرنب لأن النبي عليه السلام أكل منه حين أهدى إليه مشويًا وأمر أصحابه رضي الله عنهم بالأكل منه'' (۱) (اور خرگوش کھانے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ نبی علیہ السلام نے خود کھایا جب انہیں ہدیہ میں خرگوش کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا اور اپنے اصحاب کو بھی کھانے کا حکم دیا) (۲)۔

اور عینی نے قدوری کا قول نقل کیا ہے: ''ولا خلاف فيه لأحد من العلماء'' (اس کے جواز میں علماء میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے) اور کرخی نے بھی اپنی مختصر میں لکھا ہے: ''سبھی علماء کی رائے میں خرگوش کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے (۳)، نبی کریم ﷺ کا خرگوش کے گوشت کا ہدیہ قبول کرنا اور اسے کھانا بخاری کی روایت کتاب الہبہ سے (بہ روایت ہشام بن زید عن انس بن مالک ؓ) ثابت ہے (۴)، اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں (بروایت محمد بن جعفر وحجاج بواسطہ شعبہ

(۱) الهداية على فتح القدير، کتاب الذبائح ۹/ ۵۱۳ طبع بیروت۔
(۲) درحقیقت صاحب ہدایہ کی پیش کردہ یہ حدیث دو حدیثوں کے مجموعے کا مفہوم ہے، پہلی حدیث تو وہ ہے جس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے: ''عن هشام بن زيد قال سمعت أنسا يقول: "أنفجنا أرنبا بمر الظهران فسعى أصحاب رسول الله ﷺ خلفها، فأدركتها فأخذتها، فأتيت بها أبا طلحة فذبحها بمروة فبعث معي بفخذها أو بوركها إلى النبي ﷺ فأكله، قلت أكله؟ قال قبله'' (سنن الترمذی علی تحفۃ الاحوذی ۵/ ۲۰۰ طبع بیروت)۔
دوسری حدیث وہ ہے جس کو امام نسائی نے بروایت ابوہریرہ نقل کی ہے: ''جاء أعرابي إلى رسول الله ﷺ بأرنب قد شواها فوضعها بين يديه فأمسك رسول الله ﷺ فلم يأكل وأمر القوم أن يأكلوا وأمسك الأعرابي فقال له النبي ﷺ ما يمنعك أن تأكل قال إني صائم ثلاثة أيام من الشهر.'' (سنن النسائی، کتاب الصوم ۴/ ۲۲۲ طبع استنبول)۔
(۳) البنایہ ۹/ ۸۷۔
(۴) صحیح البخاری، کتاب الہبہ ۳/ ۱۳۰ طبع استنبول۔

عن ہشام بن زید عن أنس) حضور اقدس ﷺ کا خرگوش کا گوشت کھانا مذکور ہے (۱)۔ روایت حضرت ابوہریرہؓ جو سنن نسائی کے کتاب الصوم میں مذکور ہے، اس میں خرگوش کے بھنے ہوئے گوشت کا صحابہ کو کھانے کا حکم دینا اور خود نہ کھانا ثابت ہے اور اسی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر مجھے خواہش ہوتی تو میں بھی کھاتا (۲)، روایت سیدنا عمر بن الخطابؓ مسند احمد، صحیح بن حبان، مسند بزار، مسند اسحاق بن راہویہ میں مذکور ہے (۳)۔

المغنی میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ "خرگوش حلال ہے، سعد بن وقاص نے اسے کھایا، اس کی اجازت ابوسعید خدریؓ وغیرہ مختلف اصحاب نے دی اور یہ روایت صحیح ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کا ہدیہ قبول فرمایا (۴)۔

اور صاحب ہدایہ نے خرگوش کی حلت کی عقلی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: (اول) خرگوش درندہ نہیں ہے، (دوم) اور نہ مُردار کھاتا ہے، "ولأنه ليس من السباع ولا من أكلة الجيف فأشبه الظبي" (۵) (اس لئے کہ خرگوش نہ درندہ جانوروں میں سے ہے اور نہ مُردار خور جانوروں میں ہے، لہٰذا وہ ہرن کے مشابہ ہے)، اور جہاں تک اسے حیض آنے کا مسئلہ ہے تو اس سے کراہت طبعی تو پیدا ہو سکتی ہے کراہت شرعی نہیں، اسی لئے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے بعض مواقع پر خود نہیں کھایا، لیکن دوسروں کو کھانے کی اجازت دی جب کہ آپ ؐ کو کسی نے یہ بتایا کہ اسے حیض آتا ہے (۶)۔

---

(۱) المسند الجامع کتاب الأطعمة ۲/ ۹۴، ۹۵ طبع دار الجیل بیروت۔
(۲) سنن النسائی، کتاب الصوم ۴/ ۲۲۴ طبع استنبول۔
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: البنایہ شرح الہدایہ للعینی ۹/ ۸۷، ۸۸۔
(۴) "والأرانب مباحة، أكلها سعد بن أبي وقاص، ورخص فيها أبو سعيد وعطاء وابن المسيب والليث ومالك والشافعي وأبو ثور وابن المنذر ولا نعلم أحداً قائلاً بتحريمها إلا شيئاً، وقد صح عن أنس أنه قال ــــ وبعث بوركها (أو قال) فخذها إلى النبي ﷺ فقبله" "متفق عليه" (المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ۱۱/ ۷۱ طبع دار الفکر بیروت)۔
(۵) الہدایہ ۷/ ۱۴۱ طبع کراچی پاکستان۔
(۶) البنایہ شرح الہدایہ للعینی ۹/ ۸۸۔

ابن قدامہ نے لکھا ہے: "ولأنها حيوان مستطاب ليس بذي ناب أشبه الظبي" (۱) (یہ پاک صاف جانور ہے، ذی ناب (درندہ) نہیں ہے، پس ہرن کے مشابہ ہے)۔

پس اصل تو یہی ہے کہ کسی چیز کے حرام وحلال ہونے کا تعلق شریعت سے ہے، لہٰذا جس چیز کا کھانا اور کھانے کی اجازت دینا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اس کے حلال ہونے میں شبہ نہیں۔

رہا حکمت کا سوال تو جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا، خرگوش ہرن کے مشابہ ہے، بلی کے نہیں، فرق یہ ہے کہ بلی درندہ جانور ہے، بلی حرام چیزیں چوہا وغیرہ کھاتی ہے اور خرگوش نہ درندہ ہے، نہ حرام چیزیں کھاتا ہے، نہ مُردار خور ہے، اس لئے اس کی حرمت کا سوال نہیں پیدا ہوتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

(۱) المغنی مع الشرح الکبیر ۱۱/ ۷۱ طبع دار الفکر بیروت۔

کتاب الحظر والإباحۃ

بوقت ضرورت ٹائی لگانے کی گنجائش ہے

زید ایک کمپنی میں کام کرتا ہے، اصلاً تو اسے میدان میں کام کرنا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپنی کی آفس میں بھی جانا ضروری ہوتا ہے، کمپنی میں جانے کے لئے ٹائی لگا کر جانا ضروری ہے، کیا ایک مسلمان ایسی صورت میں ٹائی لگا سکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

گنجائش ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا دوسروں کو خون دینا اور بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے؟

موجودہ زمانہ میں دینی مدارس بالخصوص وہ مدارس جو سرفہرست ہیں، سرکار اور غیر مسلموں کی نظر میں بدظنی کا مقام اور محور بنے ہوئے ہیں، جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔

ایسی صورت حال میں ہمارے شہر کے نامور وہ افراد جو دین وملت کے خیر خواہ ہیں اور رفاہی کام میں غیر مسلموں کے شانہ بشانہ رہتے ہیں، ایسے چند حضرات ہمارے مہتمم صاحب سے مل کر درخواست کی کہ آئندہ یوم آزادی کے موقع پر شہر کے مختلف کلبوں (Clubs) اور جامعہ کا اجتماعی اقدام یہ ہو کہ ضرورت مند مریضوں کو خون دینے کے لئے بڑے پیمانہ پر مفت میں خون دینے کا کیمپ قائم ہو۔

خصوصی طور پر جامعہ کو شامل کرنے کا مقصد ان کی نظر میں یہ بھی ہے کہ جامعہ کی کارکردگی حکومت اور غیر مسلم عوام کی نظر میں اجاگر ہو۔

واضح رہے کہ یہ پروگرام مروجہ طریقہ پر سرکاری ہسپتالوں میں بلڈ بینکوں کے ماتحت جمع کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت اضطراری حالت میں مریضوں کو مفت فراہم کیا جاتا ہے، کیمپ میں خون دینے والوں کو بلڈ بینک کی طرف سے ایک کارڈ فراہم کیا جاتا ہے، جو حسب ضرورت حامل کارڈ کو خون ملنے کی ضمانت ہوتی ہے، تجربہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ کارڈ نہ ہونے پر بلڈ بینکوں کی طرف سے بالکل نہ کہہ دیا جاتا ہے، ادھر بازاروں میں بسا اوقات ایسے شدید ضرورت کے وقت بھی خون نہیں ملتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان احوال کے پیش نظر جامعہ کے بعض اساتذہ اور طلبہ کے لئے اس پروگرام میں شرکت کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

دوسروں کا خون استعمال کرنا ظاہر ہے کہ اضطراری حالت میں جائز ہے، جب خون کا استعمال جائز ہے تو خون کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے، ہبہ کرنے کے لئے حالت اضطرار کا انتظار ضروری نہیں، اگر بروقت خون نہیں ملا، یا خون ایک دوسرے کے موافق نہیں ثابت ہوا تو جب تک گروپ ملایا جائے گا اور گروپ والے آدمی کو تلاش کیا جائے گا مریض کی جان چلی جائے گی، لہذا خون کا عطیہ دینا، اس کا بینک قائم کرنا اور اس اچھے کام کے لئے کیمپ لگانا جائز اور درست ہے۔

اس ذیل میں حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند کا فتویٰ نظر میں رہے[1]، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا غیر مسلموں کی رقم مسجد کی تعمیر اور روزہ داروں کے افطار میں خرچ کرنا جائز ہے؟

غیر مسلموں کی رقم سے مسجد کی تعمیر کرانا یا اس کے روپیہ سے روزہ دار کو افطار کرانا یا

(۱) نظام الفتاوی ۱/ ۳۵۵ تا ۳۵۷ طبع اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی۔

اماموں کو تنخواہ دینا یا کسی دوسرے مد میں اس کا استعمال کہاں تک درست ہے، مفصل ومدلل تحریر فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

اگر غیر مسلم اس طرح کے کاموں کو نیکی اور بھلائی کا کام سمجھتا ہے اور کار ثواب ہونے کے ناطے اس میں مدد کرتا ہے تو اس کی مدد قبول کرنا جائز ہوگا، اسی طرح بہت سے غیر مسلم روزہ داروں کو افطار کرانا بھی کار ثواب سمجھ کر افطار کا سامان مسجدوں میں بھیجتے ہیں، اس کو بھی قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر یہ بات سمجھ میں آتی ہو کہ اس طرح کے تعاون کا مقصد سیاسی یا تجارتی مادی مفاد ہے، یا اس طرح کی مدد کو قبول کرنے کے نتیجہ میں غیر مسلموں کے مشرکانہ اعمال میں مسلمانوں کو تعاون کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو ایسی صورت حال میں اس طرح کی کسی مدد کو قبول کرنا درست نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تبلیغ دین کے لئے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع متین مذکورہ امور کے بارے میں:

جنوبی افریقہ ایک آزاد ملک ہے جس میں اکثریت حبشیوں کی ہے، مذہبا یا تو وہ

(۱) "شرط وقف الذمی أن یکون قربة عندنا وعندهم کالوقف علی الفقراء أو علی مسجد القدس بخلاف الوقف علی بیعة فإنه قربة عندهم فقط أو علی حج أو عمرة فإنه قربة عندنا فقط فأفاد أن هذا شرط لوقف الذمی فقط، لأن وقف المسلم لا یشترط کونه قربة عندهم بل عندنا کوقفنا علی حج وعمرة بخلافه علی بیعة فإنه غیر قربة عندنا بل عندهم" (رد المحتار ۶/ ۵۲۴، ۵۲۶ طبع بیروت)۔

اور البحر الرائق میں ہے: "وأما الإسلام فلیس من شرطه فصح وقف الذمی بشرط کونه قربة عندنا وعندهم کما لو وقف علی أولاده أو علی الفقراء أو علی فقراء أهل الذمة" (البحر الرائق ۵/ ۲۰۴ طبع بیروت)، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۷/ ۷۴ تا ۸۰، امداد الفتاوی ۲/ ۲۸۹، ۲۹۰، فتاوی امارت شرعیہ تحقیق حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ۱/ ۲۱۰، ۲۱۱۔

عیسائی ہیں یا بت پرست، اس وقت ملک میں متحدہ حکومت ہے، جس میں ہر طبقے کی نمائندگی ہے۔

آزادی کے بعد ہر مذہب والوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی عام اجازت ہے، اس سلسلہ میں حکومت سے اجازت لے کر اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کرسکتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے چوبیس گھنٹے اپنے مذہب کی اشاعت کرسکتے ہیں، جس طرح امریکہ اور یورپ سے عیسائی حضرات اور ممالک اسلامیہ سے مسلمان اپنے مذاہب کی اشاعت کرتے ہیں۔

یہاں کے مسلمان بھی اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں، جس کا پورا انتظام علماء کے ہاتھ میں ہوگا اور اس پر سے کوئی بھی غیر شرعی پروگرام شائع نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہوگیا ہے، اکثر ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کے موافق ہیں، مگر بعض حضرات اس کے شدید مخالف ہیں۔

موافق حضرات کے دلائل اور حجت یہ ہیں:

۱- یہ ایک ذریعہ اشاعت ہے، لاؤڈ اسپیکر کی طرح اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔

۲- غیر مسلموں کو دین پہنچانے کا یہ بہترین ذریعہ ہے، خاص کر حبشی حضرات کو۔

۳- اکثر مسلمان ریڈیو پر غلط پروگرام سنتے ہیں، دینی پروگرام ہوتے ہوئے اس میں کسی حد تک تخفیف ہوگی۔

۴- قادیانی، شیعہ اور روشن خیال حضرات بھی اپنا اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں، ہمیں ان کے غلط پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

۵- مسلمانوں کو دین سکھانے کا یہ نافع ذریعہ ہے۔

۶- چونکہ قبضہ وکنٹرول پورا علماء اور صحیح العقیدہ حضرات کے ہاتھ میں ہوگا، غلط اشاعت کا اندیشہ نہیں۔

جو حضرات اس کے موافق نہیں، ان کا کہنا یہ ہے:

۱- اس کی کوئی ضرورت نہیں۔
۲- یہ کافروں کا طریقہ ہے، ہمارے اسلاف کا نہیں۔
۳- شیعہ اور دوسرے فرق باطلہ ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہیں تو کریں، ہمیں مثبت انداز میں ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔
۴- ان کے نئے نئے طریقوں کی کوئی حد نہیں، ہم کہاں تک ان کا مقابلہ کریں گے، ہمیں تو قرآن وحدیث پر عمل کرنا چاہئے۔
۵- جس طرح تبلیغی جماعت کے حضرات کام کرتے ہیں ہمیں بھی اسی طرح کام کرنا چاہئے۔
۶- جماعت کے اکابر کو بھی دین کی اشاعت کی اتنی ہی فکر ہے تو وہ کیوں ان ذرائع کو استعمال نہیں کرتے ہیں؟
۷- آپ کا یہ کہنا کہ موسیقی اور دوسرے پروگرام نہیں سنیں گے، یہ بالکل غلط ہے، شیطان نے ان کو اتنا بہکا دیا ہے کہ وہ آپ کے پروگرام کی طرف بالکل توجہ نہیں کریں گے۔
۸- آج آپ ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں کل آپ ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے جواز کے قائل ہوں گے۔
۹- مفتی شفیع صاحبؒ جب ریڈیو پاکستان پر سے تفسیر بیان فرماتے تھے تو اس کا کوئی چرچا نہیں تھا، مگر یہی تفسیر جب کتاب کی شکل میں شائع ہوئی تو بہت مقبول ہوئی، لہذا ہمیں بھی ریڈیو کے بجائے اس طرح اشاعت پر توجہ دینی چاہئے۔

ان حضرات کے مفصل دلائل وبیان اس استفتاء کے ساتھ الگ منسلک ہیں۔

۱- کیا ریڈیو سے دینی پروگرام شائع کرنا جائز ہے یا نہیں؟
۲- مسلمانوں کے مفاد کے خاطر اور اسلام کی اشاعت کے خاطر مسلمانوں کو اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۳- ممالک اسلامیہ میں ریڈیو پر قرآن کی تلاوت وتفسیر، احادیث، ملفوظات مشائخ اور تقاریر شائع کئے جاتے ہیں، ان کا یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ حرام یا مکروہ یا مندوب ومباح ومستحسن ہے؟ وضاحت فرمائیں۔
۴- اپنی ذاتی رائے بھی بیان فرمائیں تاکہ ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

امید ہے کہ ہماری رہنمائی فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق

مسلمانوں کے لئے موقع ہے کہ جنوبی افریقہ میں اپنا نجی ریڈیو اسٹیشن قائم کریں اور اس کے ذریعہ اسلام کی ترویج واشاعت کا کام کریں، سوال میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اگر ایسا ریڈیو اسٹیشن حاصل کیا جاسکا تو اس کا پورا انتظام علماء کے ہاتھوں میں ہوگا اور اس پر کوئی غیر شرعی پروگرام نشر نہیں ہوگا۔

سوال میں ہر دو نقطہ نظر رکھنے والے علماء کے دلائل بھی ذکر کردئے گئے ہیں، جس پر غور کیا گیا۔

اس حقیر کے نزدیک ریڈیو کی حقیقت ذریعہ ابلاغ اور ایک آلہ کی ہے، جس کے ذریعہ ہم اپنی بات دور دور تک پہنچا سکتے ہیں اور ریڈیو کا آج جو بے جا استعمال ہورہا ہے، یہ ایک ذریعہ ابلاغ کا غلط استعمال ہے، جہاں تک نفس ریڈیو کے ذریعہ اپنی بات دور تک پہنچانے کا سوال ہے، اس میں کوئی عیب نہیں، اس لئے فقہاء کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ "ریڈیو" "ما لا تقوم المعصية بعينه" کی قبیل سے ہے، یعنی اصل شئ میں کوئی معصیت نہیں ہے، معصیت باہر سے آتی ہے اور وہ اشیاء جن کی ذات میں کوئی معصیت نہ ہو، بلکہ معصیت خارج سے آتی ہے، ان کا استعمال اس خارجی معصیت کا ارتکاب کئے بغیر جائز ہے، علاوہ اس کے شریعت کا اصول "سد ذریعہ" بھی ہے اور "فتح ذریعہ" بھی ہے، اگر ریڈیو کا استعمال مقاصد خیر کے لئے کرنا مقصود ہے تو جائز ہوگا اور اگر اس کا استعمال معصیت کے لئے ہو تو اگرچہ نفس ریڈیو میں کوئی عیب نہیں، لیکن معصیت کا دروازہ روکنے کے لئے اس کا استعمال ممنوع ہوگا (سد ذرائع اور فتح ذرائع کے تفصیلی احکام کتب اصول میں مطالعہ

کریں)(۱)۔

دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ الکٹرونک میڈیا انسانی ذہن وفکر کی تبدیلی میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طاقتور اور مؤثر ذریعہ کو اشاعت حق کے لئے استعمال نہ کریں (اگر ایسا کرنا اور شر سے محفوظ رکھنا ممکن ہو)۔

یہ کہنا کہ اس کی ضرورت نہیں، صحیح نہیں ہے، مسلمانوں کو مسائل واحکام سے واقف کرانے کے لئے غیر مسلموں تک سیرت نبوی اور صحابہ کرام ودیگر علماء وصالحین کے واقعات مؤثر طور پر پیش کرنا اور جو ہماری مجلسوں میں نہیں آسکتے، ان کے گھر گھر میں حق کی آواز پہنچانے کی ضرورت ہے اور یہ تسلیم کرکے چلنا کہ سبھی لوگ صرف گانا بجانا سننا چاہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بہت سے سلیم الفطرت لوگ اپنی ذہنی الجھنوں کا حل جاننا چاہتے ہیں، ایسے لوگ ریڈیائی پیغام اور نشریہ کے ذریعہ اسلام کی سچائی تک پہنچ سکتے ہیں۔

ریڈیو یا اس طرح کے دوسرے سائنسی آلات پر کافروں کی اجارہ داری نہیں ہے، سلف کے زمانہ میں جو چیز موجود نہیں تھی، اس کے بارے میں سلف کے تعامل سے استدلال غلط ہے، سیکڑوں ایسی چیزیں ہیں جو سلف کے زمانہ میں نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے ان کا استعمال نہیں کیا۔ اب موجود ہیں اور اب ہم ان کا استعمال کرتے ہیں، عہد نبوی وصحابہ میں کتابوں کی نشر واشاعت کا نظام نہیں تھا، بعد کو مخطوطات کا رواج ہوا، پھر لیتھو پریس کا، پھر آفسیٹ کا اور اب کمپیوٹر پرنٹنگ کا، تو کیا ہم ان اشیاء کا استعمال نہیں کریں، اس لئے کہ اسلاف کا طریقہ نہیں ہے۔

نئے چیلنجز کا تو مقابلہ کرنا ہی ہے، قرآن کریم نے دعوت، تبلیغ اور تحدیث کا حکم دیا ہے، اس کی صورت نہیں متعین کی گئی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذرائع مختلف زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔

خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دعوت تبلیغ میں نئے زمانہ میں دعوت کے لئے قدیم اصولوں پر مبنی نئے طریقہ اور نظام کو اختیار کیا گیا ہے، ورنہ تفصیلی طور پر جماعت کے طریقۂ کار کے

(۱) الفروق للقرافی ۲/۲۳۲ طبع بیروت، تہذیب الفروق علی الفروق ۲/۴۴، مقدمہ ابن رشد/۱۹۷، الموافقات ۴/۱۹۸ طبع قاہرہ، الموسوعۃ الفقہیہ ۲۴/۲۷۶ تا ۲۸۲ وغیرہ۔

ہر جزئیہ کی متعین صورت اسلاف کے یہاں نہیں ملے گی، حضرت مولاناؒ نے جس طرح اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر یہ نیا طریقہ اپنایا وہ اپنی جگہ کتنا مؤثر ہے، وہ واضح ہے، محض کچھ وہمی امور کا سہارا لے کر ”کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے“ اس مفید کام کو روکنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہر حال حاصل بحث یہ ہے کہ اس حقیر کے نزدیک:

۱- ریڈیو کے ذریعہ دینی پروگرام شائع کرنا شرعاً جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے مفاد اور اسلام کی اشاعت کی خاطر مسلمانوں کو ان مخصوص مقاصد کے لئے اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا (جو اشاعت فحشاء ومنکرات سے پاک ہو) جائز ہے۔

۳- ریڈیو پر تلاوت، تفسیر، احادیث وغیرہ کی اشاعت کا عمل شرعاً جائز ہے، بلکہ سعودیہ وغیرہ میں بہت سے غیر مسلموں نے ریڈیوں پر اسلام کے تعارفی نشریوں کی برکت سے اسلام بھی قبول کیا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجاہد الاسلام قاسمی ۷/جون ۱۹۹۵ء

الجواب صحیح
انیس الرحمٰن قاسمی
نائب قاضی شریعت، ۷/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح
محمد جنید عالم قاسمی
۷/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح
نسیم احمد قاسمی
رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ۷/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح
سہیل احمد
نائب مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
۷/محرم ۱۴۱۶ھ

میں گھر کا پیسہ شامل ہے، اعلانیہ طور پر خانگی بٹوارہ نہیں ہوا ہے اور زبانی طور سے
ہم سب سے یہی کہتے ہیں کہ ہم مل کر ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔
امید کہ جناب والا اس کا جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق

ہمارے سماج میں عام طور پر یہ بات معروف ہے، چند بھائی اجمالی خاندان کی طرح رہتے ہیں، ان میں کوئی زیادہ کماتا ہے تو کوئی کم اور کوئی کماتا ہی نہیں ہے، کوئی پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے، کوئی کھیتی باڑی کو دیکھتا ہے اور کوئی نوکری کرتا ہے، مشترک جائداد ہے، اس کی آمدنی بھی گھر پر صرف ہوتی ہے، کمانے والے کو نوکری یا تجارت سے جو آمدنی آتی ہے وہ بھی گھر پر خرچ ہوتی ہے، کچھ عرصہ تک تو گھر بغیر حساب کتاب بہت اچھی طرح چلتا ہے، لیکن پھر میں اور تو، اور میرے اور تیرے کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے، معاملات واضح نہیں رہتے، کوئی شخص اپنی آمدنی سے حاصل جائداد کو اپنی ذاتی قرار دیتا ہے، دوسرے لوگ اسے مشترک قرار دے کر اس میں اپنے حصہ کے طالب ہوتے ہیں، ان حالات میں سخت بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے آپ کے لئے مندرجہ بالا حالات میں مشورہ یہ ہے کہ آپ دیگر بھائیوں کو بٹھا کر پورے معاملات صاف کر لیجئے اور پھر اپنی ذاتی آمدنی سے جو کچھ خریدنا ہو خریدئے۔ اب تک جو کچھ حاصل ہوا یا خرچ ہوا اسے مشترک مانئے، کس پر کم خرچ ہوا کس پر زائد خرچ ہوا یہ ہرگز نہ جوڑئے، یہ ساری گفتگو آپ کی ذاتی، موروثی یا اپنی حاصل کردہ جائداد کے بارے میں ہے، آپ بھائیوں میں سے کسی کی اہلیہ کو اس کے میکہ سے یا کہیں اور سے کوئی آمدنی ہوئی ہو یا کوئی جائداد حاصل ہوئی ہو تو وہ مشترک شمار نہیں ہوگی، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوہ کو کتنا حصہ ملے گا جبکہ اس کی کوئی اولاد نہ ہو؟

میرا نام کلام الدین ہے، میرا ایک بڑا بھائی عظیم الدین تھا جو پانچ ماہ قبل انتقال کر گیا، مرحوم بھائی کی ایک بیوہ ہے، کوئی اولاد نہیں ہے، ہمارے والدین باحیات ہیں، گاؤں پر رہتے ہیں، دہلی میں ہم دونوں بھائیوں نے اپنی کمائی سے

ایک چھوٹا سا مکان بنایا ہے، کاغذ پر ہم دونوں کا نام ہے، مرحوم بھائی کے سسر صاحب کا کہنا ہے کہ اس مکان میں وہ آدھے کے حق دار ہیں، یعنی مرحوم بھائی کا پورا حصہ اس کی بیوہ کو ملنا چاہئے، اس طرح وہ ترکہ میں والدین کے حق کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، فی الحال انہوں نے اس مکان میں کرایہ دار رکھ دیا ہے۔ مزید برآں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ گاؤں پر جو مکان ہے جو والد صاحب کے نام سے ہے، اس میں بھی مرحوم کا حصہ ہے جو بیوہ کو ملنا چاہئے۔
شرعی اعتبار سے بیوہ کا کہاں اور کتنا حصہ بنتا ہے اس کی وضاحت کر دی جائے، اللہ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

الجواب وباللہ التوفیق

دلی میں جو مکان دونوں بھائیوں نے اپنی کمائی سے بنایا اس میں دونوں بھائی آدھے آدھے کے مالک ہوئے، اب جب بڑے بھائی عظیم الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کا آدھا حصہ ان کا متروکہ ہوا، تجہیز و تکفین اور ادائے دین اور اجرائے وصیت از ثلث مال کے بعد جو بچے اس میں چار آنہ اس کی بیوہ کا ہوا، ماں کو بھی اس میں چار آنہ (ثلث الباقی) اور باپ کو آٹھ آنہ ملے گا۔
والد چونکہ زندہ ہیں، اس لئے ان کی ملکیت میں ابھی تقسیم ہونے کا کوئی سوال نہیں، ان میں عظیم الدین کی بیوہ کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی، چار لڑکے اور ایک لڑکی کے درمیان وراثت کی تقسیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین مسئلہ ہذا کے بارے میں:
زید نے فرحانہ سے شادی کی، اس کے بطن سے ایک لڑکا حامد اور ایک لڑکی زاہدہ پیدا ہوئی، جو باحیات ہیں، فرحانہ کے انتقال کے بعد زید نے دوسری شادی رخسانہ سے کی، اس کے بطن سے تین لڑکے راشد، خالد، عابد پیدا ہوئے جو باحیات ہیں، اس کے بعد زید کا انتقال ہو گیا، اس نے ورثہ میں دو مکان اور پانچ بیگھا زمین چھوڑی، جس کی صورت یہ ہے کہ ایک مکان اپنی دوسری بیوی کو

انتقال کے وقت مہر میں دے دیا، پہلی بیوی کے لڑکے کے نام ایک بیگھا زمین نابالغ میں لکھ دیا تھا جواب تک اس کے نام ہے، دوسری بیوی کے بھی ایک لڑکے کے نام آدھا بیگھا زمین نابالغ کے وقت سے اس کے نام ہے۔

۱- مندرجہ بالا صورت میں وراثت کی تقسیم فرمائیں۔

۲- جن لڑکوں کے نام زمین رجسٹرڈ ہے کیا وہ ان لڑکوں کے حصہ میں رہتے ہوئے بقیہ اس زمین میں تقسیم ہوگی جو زید مرحوم کے نام ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

۱- زید نے مرنے کے بعد جو کچھ اپنی ملکیت چھوڑی ہے اس میں سے پہلے خرچ تجہیز وتکفین نکالا جائے گا، پھر اس کے تمام دیون ادا کئے جائیں گے، اگر زید نے پہلی زوجہ فرحانہ کو مہر ادا نہیں کیا تھا تو وہ بھی زید پر دین ہے جو زید کے ترکہ سے نکال کر فرحانہ کے وارثان میں تقسیم کیا جائے گا، پھر اگر زید نے غیر وارث کے حق میں کوئی وصیت کی ہو تو تہائی مال سے وصیت پوری کی جائے گی، بعد ازاں بقیہ کل ترکہ زید کی زوجہ رخسانہ جو بوقت موت زید کی زوجیت میں تھی، زید کے چاروں لڑکوں اور ایک لڑکی کے درمیان اس طرح تقسیم ہوگا کہ ترکہ کو ۷۲ حصوں میں تقسیم کرکے زوجہ رخسانہ کو ۹/ حصے، چاروں لڑکوں حامد، راشد، خالد اور عابد میں سے ہر ایک کو ۱۴، ۱۴/ حصے اور لڑکی زاہدہ کو ۷/ حصے ملیں گے۔

۲- زید نے اپنا جو مکان اپنی زوجہ رخسانہ کو مہر میں دے دیا تھا وہ زوجہ رخسانہ کی ملکیت ہے، وہ مکان زید کے ورثاء میں تقسیم نہیں ہوگا، اسی طرح زید نے اپنے نابالغ لڑکے حامد کو ایک بیگھا زمین اور دوسری بیوی سے ایک نابالغ لڑکے کو آدھا بیگھا زمین لکھ دی تھی اور وہ زمین ان بچوں کے نام رجسٹرڈ ہیں، یہ زمینیں زید کی طرف سے ان بچوں کے نام ہبہ قرار پائیں گی، اور والد کا قبضہ ہی نابالغ بچہ کی طرف سے قبضہ تصور کیا جائے گا، فتح القدیر میں ہے: "وإذا وهب الأب لابنه الصغير هبة ملكها الابن بالعقد، لأنه في قبض الأب فينوب عن قبض الهبة" (۱)، لہذا دونوں بچوں کے نام رجسٹرڈ زمین ان بچوں

(۱) فتح القدیر ۹/ ۳۴۔

کی ملکیت ہوگی اور ان میں وراثت جاری نہیں ہوگی (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لڑکیوں کے ساتھ بھتیجہ کا حصہ

زید اپنی چھ دھور زمین چھوڑ کر مر گئے اور اس وقت ان کی اولاد میں دو لڑکی ایک بھتیجہ ہے۔ چھ دھور زمین پر بھتیجہ کا مکان ہے، لہذا دونوں لڑکی اور بھتیجہ کا حصہ کیا ہوگا؟ ہمارا اصول فقہ کیا کہتا ہے، جوابی ڈاک سے جلد از جلد مطلع کریں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر زید نے انتقال کے وقت صرف اپنی دو بیٹیوں اور بھتیجہ کو چھوڑا ہے تو بعد تقدیم ما یتقدم علی الإرث ان کی جائداد (۶ دھور) کو چھ حصے کرکے دو دو حصہ ان کی دونوں لڑکیوں اور بھتیجے میں سے ہر ایک کو (یعنی دو دو دھور فی کس) از روئے شرع ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی، تین لڑکے اور چار لڑکیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم

محمد شریف میاں نے اپنے انتقال کے وقت ایک بیوی، تین لڑکے اور چار لڑکیوں کو وارثان چھوڑا، مذکورہ وارثان کو از روئے سہام شرعی کیا ملے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق

بشرط صحت سوال وعدم موانع ارث اخراجات کفن دفن وادائے قرض وغیرہ کے بعد شریف میاں مرحوم کے بقیہ متروکہ (۱۶) کو اسی حصے کرکے دس حصے یعنی ۲ آنہ ان کی بیوی کو، چودہ حصے کرکے (۲/ ۹ ۳/۵ پائی فی کس) ان کے تینوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو اور سات سات حصے کرکے

(۱) واضح رہے کہ زید مرحوم نے اپنی حیات میں جن دو لڑکوں کو ایک بیگھا اور آدھا بیگھا زمین بطور ہبہ لکھ دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ دونوں لڑکے زید مرحوم کی باقی جائداد سے محروم نہیں ہوں گے، بلکہ ان کو بھی اتنا حصہ ملے گا جتنا ان کے دوسرے بھائیوں کو مل رہا ہے۔

(۱/۴ ۴/۵ پائی فی کس) ان کی چاروں لڑکیوں میں سے ہر ایک کو شرعاً ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تقسیم ترکہ کا اہم مسئلہ

عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، چھوڑا ایک بیوی مسماۃ مسوپن، ایک لڑکا محمد جمال، دو لڑکی شرفو خاتون اور برفو خاتون، پھر شرفو خاتون کا انتقال ہوا چھوڑا ایک شوہر عبدالسلام، ایک لڑکا (جو چند روز کے بعد انتقال کر گیا) ایک ماں مسماۃ مسوپن، ایک بھائی جمال، ایک بہن برفو، پھر محمد جمال نے انتقال کیا، چھوڑا ایک بیوی مسماۃ امت، دو لڑکا محمد شفیع اور کمال، چھ لڑکی ہاجرہ خاتون، سیدہ خاتون، حبیبہ خاتون، نسیمہ خاتون، شمیمہ خاتون، حمیمہ خاتون، ایک ماں مسماۃ مسوپن، ایک بہن برفو، اب بتایا جائے کہ عبدالرزاق کی جائداد میں کس کا کتنا حصہ ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق

بصورت صحت سوال وعدم موانع ارث، اخراجات کفن دفن واداے قرض وغیرہ کے بعد عبدالرزاق مرحوم کے بقیہ متروکہ (۱۶/ آنہ) کو تین ہزار آٹھ سو چالیس حصے کر کے ان کی بیوی مسماۃ مسوپن کو نو سو حصے (۳/ ۹ پائی)، ان کی لڑکی برفو خاتون کو آٹھ سو چالیس حصے (۳/ ۶ پائی)، عبدالسلام زوج شرفو کو سات سو حصے (۲/ ۱۱ پائی)، مسماۃ امت زوجہ جمال کو دو سو دس حصے (۱۰ ½ پائی)، محمد جمال کے دونوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو دو سو اڑتیس حصے (۱۱ ۹/۱۰ پائی فی کس) اور ان کی چھ لڑکیوں میں سے ہر ایک کو ایک سو انیس حصے (۵ ۹/۲۰ پائی فی کس) از روئے شرع ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتابیات

قرآن

القرآن الکریم

تفسیر

الجامع لأحكام القرآن	الإمام أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی
التفسير المظهری	الشيخ ثناء الله الباني بتی

احادیث اور ان کی شروحات

الصحيح للبخاری	الإمام أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاری
الصحيح لمسلم	الإمام أبو الحسن مسلم بن الحجاج القشيری
سنن الترمذی	الإمام أبو عيسى محمد بن سورة الترمذی
سنن أبی داؤد	الإمام سليمان بن الأشعث أبو داؤد السجستانی
سنن النسائی	الإمام أحمد بن علی النسائی
سنن الدار قطنی	شيخ الإسلام الحافظ علی بن عمر الدار قطنی
سنن سعيد بن منصور	الإمام سعيد بن منصور بن شعبه الخرسانی
المسند للإمام احمد بن حنبل	الإمام أحمد بن حنبل أبو عبد الشيبانی
مصنف بن أبی شيبه	الإمام أبو بكر عبد الله بن محمدبن أبی شيبه الكوفی
المسند الجامع	[رتبه] الدكتور بشار عواد معروف وشركاءه

مشكاة المصابيح	الإمام ولى الدين محمد بن عبد الله الخطيب التبريزى
اعلاء السنن	المحدث العلامة ظفر أحمد التهانوى
شرح معانى الآثار	الحافظ أبو جعفر أحمد الطحاوى الحنفى
فتح البارى	الحافظ أبو الفضل شهاب الدين ابن حجر العسقلانى
عمدة القارى	العلامة بدر الدين أبو محمد محمود بن أحمد العينى
فيض البارى	الحافظ المحدث أنور شاه الكشميرى
معالم السنن شرح سنن أبى داؤد	الإمام أبو سليمان حمد بن محمد الخطابى
شرح النووى	الشيخ محى الدين أبو زكريا يحى بن شرف الدين النورى
تحفة الأحوذى	الحافظ أبو العلا محمد عبد الرحمن المباركفورى

فقه وأصول فقه

الف

أحكام الأوقاف	أبو بكر أحمد بن عمر الشيبانى المعروف بـ "الخصاف"
الاختيارات الفقهية	الشيخ أبو الحسن على بن محمد بن عباس البعلى
الأشباه والنظائر	العلامة زين الدين بن النجيم الحنفى المصرى
امداد الفتاوى	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"

ب

البحر الرائق	العلامة زين الدين بن النجيم الحنفى المصرى
بدائع الصنائع	الشيخ علاؤ الدين أبو بكر بن مسعود الكاسانى الحنفى
بداية المجتهد	القاضى أبو الوليد بن رشد القرطبى
البلاغ	مفتى أعظم نمبر

ت

التبليغ	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"
تبيين الحقائق	العلامة أبو محمد فخر الدين عثمان بن على الزيلعى
تنوير الأبصار	شيخ الإسلام محمد بن عبد الله التمرتاشى
تهذيب الفروق	الشيخ محمد على بن حسين المكى المالكى

ث

الثمر الدانى فى تقريب الحانى	الشيخ صالح عبد السميع الآبى الأزهرى

ج

جواهر الفقه	الشيخ محمد شفيع العثمانى الديوبندى

ح

حاشية الدسوقى	الشيخ محمد بن أحمد بن عرفه الدسوقى
حاشية شلبى على تبيين الحقائق	الشيخ الإمام الشلبى
حاشية الهداية على هامش فتح القدير	الشيخ الشهيد سعد بن عيسى بن امير خان
الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"

د

الدار المختار	العلامة علاؤ الدين الحصكفى
الدر المنتقى على شرح الملتقى	العلامة علاؤ الدين الحصكفى

ر

ردالمحتار	العلامة محمد أمين ابن عابدين الشامى

ش

الشرح الكبير	الشيخ ابو البركات سيدى أحمد بن محمد العدوى الدردير

ع

عمدة الرعاية	الشيخ أبو الحسنات عبد الحى اللكنوى

ف

فتاوی امارت شرعیه	الشیخ أبو المحاسن محمد سجاد
الفتاوی التاتارخانیة	الشیخ عالم بن العلاء الأنصاری الهندی
فتاوی دار العلوم	[مرتب] الشیخ المفتی ظفیر الدین المفتاحی
فتاوی قاضی خان	فخر الدین محمود بن عبد العزیز الأوزجندی الفرغانی
الفتاوی الهندیة	الشیخ نظام الدین وجماعة من علماء الهند الأعلام
فتح باب العنایة فی شرح النقایة	الشیخ علی بن سلطان محمد الهروی المعروف بہ "ملا علی قاری"
فتح القدیر	الإمام کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیراسی المعروف بہ "ابن الهمام"
الفروق	الإمام شهاب الدین أحمد بن إدریس بن عبدالرحمن القرافی
کبیری	
کتاب العشر والزکاة	الشیخ عبد الصمد الرحمانی
کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة	الشیخ عبد الرحمن الجزیری
کفایت المفتی	الشیخ المفتی کفایت الله المعروف بہ "مفتی أعظم"

م

المبسوط	شمس الأئمة السرخسی
مجله فقه اسلامی	[مرتب] القاضی مجاهد الإسلام القاسمی
مجمع الأنهر	المحقق عبد الله بن محمد سلیمان داماد آفندی
مجموعه رسائل ابن عابدین	العلامة محمد أمین بن عابدین الشامی
مجموعه فتاوی ابن تیمیه	شیخ الإسلام أحمد بن تیمیه
مجموعه فتاوی ابن باز	الشیخ عبد العزیز بن عبد الله بن باز
معین الحکام	أبو الحسن علی بن خلیل الطرابلسی
المغنی	الإمام شمس الدین ابن قدامه المقدسی
مقدمه ابن رشد	الإمام أبو الولید محمد بن أحمد بن رشد
مناسک ملا علی قاری	الشیخ رحمة الله السندی
الموافقات	أبو إسحاق إبراهیم بن موسی اللخمی

ن

نظام الفتاوی	الشیخ المفتی نظام الدین الأعظمی

هـ

الهدایة	الإمام أبو الحسن علی بن أبی بکر المرغینانی

لغت وموسوعه

لسان العرب	الإمام جمال الدین بن منظور
موسوعة عمر بن الخطاب	الدکتور روّاس قلعه جی
موسوعة علی بن أبی طالب	الدکتور روّاس قلعه جی
موسوعة عبد الله بن مسعود	الدکتور روّاس قلعه جی
الموسوعة الفقهیه	وزارة الأوقاف والشؤن الإسلامیة، الکویت